اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

فروری ۲۰۲۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan February 2023

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی نئی تصنیف

اسلام اور تعمیرِ سیرت
عصرِ حاضر میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

’اسلام اور تزکیۂ نفس‘ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی ضخیم علمی کتاب (۹۲۸ صفحات) اور دو مختصر کتابچوں کے باوجود ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس میں اس موضوع کا احاطہ بھی کیا گیا ہو اور وہ متوسط حجم کی بھی ہو۔ بہت سے اضافی مباحث کے ساتھ۔ ۴۰۰ صفحات

مکتبہ البرہان لاہور

قارئین توجہ فرمائیں

* البرہان کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنا واٹس ایپ نمبر یا ای میل ID ہمیں ارسال فرمائیں تاکہ بوقت ضرورت ان سے رابطہ کیا جا سکے۔

* اس ماہ سے ہم ''البرہان کے نام'' سے ایک نیا کالم شروع کر رہے ہیں جس میں قارئین کی آراء، مشوروں، تنقید اور تبصروں کو جگہ دی جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ البرہان پڑھنے کے بعد فون، واٹس ایپ، ای میل، فیس بک، خط کے ذریعے پرچے کے بارے میں اپنی آراء سے نوازیں۔ ہم آپ کے ردّعمل کا خیر مقدم کریں گے۔

(حافظ محمد عمران طحاوی)
ادارتی معاون
0300-4107282

دفاتر کی منتقلی

ماہنامہ البرہان، تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اور تدریس القرآن
کے دفاتر عارضی طور پر ۹۱۔ بابر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن
(سابقہ دفتر سے تھوڑا سا پہلے بائیں ہاتھ) منتقل ہو گئے ہیں

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۷، شمارہ ۲، فروری ۲۰۲۳ء / رجب المرجب ۱۴۴۴ھ

مشمولات

O فکرونظر — یہ تنہائی — مدیر — ۴

O تعلیم و تربیت

- دینی مدارس کے نصاب ونظام پر نظرثانی کی ضرورت — مفتی تقی عثمانی — ۵
- سماجی علوم اور دینی تقاضے (آخری قسط) — احمد جاوید — ۱۰
  سماجی علوم کی اسلامی تشکیل نو مسلم اہل علم پر فرض ہے
- افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۰
- قاسم علی شاہ صاحب کی خدمت میں — مدیر — ۲۹
  اصل چیز قوم کی تعلیم وتربیت ہی ہے

O تفہیم مغرب

- مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی — انجینئر گلبدین حکمت یار — ۳۲
- مغرب کا معاشی نظام ایک سراب ہے — اوریا مقبول جان — ۳۵
- یورپ اور مغرب میں انسانی کتے — ڈاکٹر محمد باقر خاکوانی — ۴۱

O افغانستان

- افغانستان - ملا عمرؒ کی پالیسیوں پر اصرار — رشید صافی — ۴۲
- پاک افغان تعلقات میں امریکی کردار — ۴۵
- افغانستان میں خواتین کی تعلیم اور ملازمت — مدیر — ۴۸
  مغربی ممالک اور سیکورٹی کونسل کے مطالبات

O تفہیم دین

- اسلام کا معاشی نظام کہاں ہے؟ — ۵۰
- ہم خیر القرون جیسا معاشرہ کیوں نہیں چاہتے؟ (۳) — سید خالد جامعی — ۵۲
- پاکستان میں غلبۂ اسلام بذریعہ قانون سازی — ۵۷
- 'امت' کا تصور کہاں کھوگیا؟ — مدیر — ۶۰

O فکرودانش
انسانی آبادی کی منصوبہ بندی اللہ کررہا ہے — رضی الدین سید — ۶۳

O کس قیامت کے یہ نامے
البرہان کے نام [تبصرے، تنقید، مشورے] — ۷۴

English Section ۸۲
Stabilizing the Economy — Dr. Javaid Akbar Ansari
An Islamic Revolutionary Approach

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت
اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
۹۱۔ بابر بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محمد محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

یہ تنہائی

یہ تنہائی عزیز ہے مجھ کو
یہ تنہائی
مجھے
ہراساں نہیں کرتی
شرمندہ نہیں کرتی
کہ مجھے فخر ہے
مَیں نے وہ کہا
جو مَیں نے سوچا
میرا کہا کسی کا اُگلا ہوا نہیں تھا
میرے خیال میں بانکپن تو تھا
گو وہ تیری سمجھ سے بالا تھا

میرا خیال
دبیز تاریکیوں کی وادیوں میں تنہا
اک ٹمٹماتا دِیا
طوفانِ بلاخیز کے تھپیڑے
اسے بجھا سکے
نہ مجھے رلا سکے
نہ یہ میرے ارض وسما میں سما سکے
ہاں!
یہ تنہائی عزیز ہے مجھ کو

میرے ہمدم! میرے محبوب!
کہاں ہو تم؟

تیرے ہجر نے دیئے
وہ زخم
جو مجھ کو عزیز تر ہیں وصال سے
یہ سبق لیا ہے مَیں نے ایوبؑ سے
اور اس ایک رجل عظیمؑ سے
جس نے کہا
اَشۡكُوۡ بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَيۡكَ
ہاں! یہ پتھر عزیز تر ہیں
مجھے رُخِ ماہِ جمال سے

ہاں!
یہ تنہائی عزیز ہے مجھ کو

اور مجھ کو گلہ نہیں
نہ تجھ سے
نہ پاسباں سے
کہ مَیں ہوں وفا کا قیدی
نہ کوفیوں سے گِلہ ہے مجھ کو
نہ آب جو کی تلاش مجھ کو
حُسَینیوں کا چلن قدیمی
یہ خشک ندّی کے سنگ ریزے
مجھ کو عزیز تر ہیں
نِعم ہائے دو جہاں سے
ہاں! یہ تنہائی عزیز ہے مجھ کو

تعلیم و تربیت

مفتی محمد تقی عثمانی

دینی مدارس کے نصاب و نظام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے

دینی مدارس کے نصاب و نظام پر نظر ثانی کا مقصد یہ ہے کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے حضرات ایک عالم دین کی حیثیت میں زیادہ ٹھوس اور مستحکم استعداد کے حامل ہوں اور زیادہ مؤثر اور زیادہ وسیع دینی خدمات انجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ایک عالم دین کی حقیقی ضروریات کیا ہیں؟ وہ موجودہ نصاب و نظام سے پوری ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ پوری نہیں ہو رہیں تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ ان اسباب کو دور کر کے کس طرح مطلوبہ معیار حاصل کیا جا سکتا ہے؟

مدارس کا علمی اور عملی معیار نحطاط کا شکار ہے

اس ناقبل انکار حقیقت پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا علمی اور عملی معیار مسلسل انحطاط کا شکار ہے اور ان کی پیداوار اپنی صفات اور کیفیت کے لحاظ سے روز بروز بہ زوال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد وہ فرائض خاطر خواہ طور پر انجام دینے سے قاصر رہتی ہے جو بحیثیت عالم دین اس پر عائد ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جس رفتار سے اچھی استعداد اور اعلیٰ کردار کے حامل علماء کرام کی ضرورت بڑھ رہی ہے اتنا ہی ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کا دائرہ اثر و نفوذ روز بروز سمٹ رہا ہے۔ اس بات کا اعتراف نہ کرنا حقیقت ناشناسی کے مترادف ہوگا کہ پہلے ایک عالمِ دین کی بات معاشرے میں جس وزن اور جس تاثیر کی حامل ہوتی تھیں اور اس کو جس قدر وسیع قبولیت عامہ حاصل ہوتی تھی اب اس صورت حال میں بڑی تیزی کے ساتھ فرق آ رہا ہے۔ اس کا ایک سبب بلا شبہ یہ بھی ہے کہ ذہنوں پر مادیت کا غلبہ پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے اور بحیثیت مجموعی لوگوں کے افکار و اعمال پر دین کی گرفت ہی ڈھیلی پڑ گئی ہے لیکن اس کا ایک بہت بڑا سبب خود ہمارے اپنے نقائص بھی ہیں اور جب تک ان نقائص کا کھلے دل اور وسیع

حوصلے کے ساتھ جائزہ لے کر ان کے ازالے کی کوشش نہیں کی جائے گی اس سنگین اور تشویش ناک صورتِ حال میں تبدیلی لانا بہت مشکل ہے۔

اس جائزے کے بہت سے پہلو ہیں لیکن اگر ان سب پر گفتگو کی جائے تو بات کے موضوع سے دور نکل جانے کا اندیشہ ہے اس لیے فی الحال ہم گفتگو کو صرف دینی مدارس کے نصاب و نظام کی حد تک محدود رکھتے ہوئے ان اسباب کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے دینی مدارس کا مطلوبہ معیار گھٹ رہا ہے اور ان کی افادیت محدود ہو رہی ہے۔ ہماری یہ گفتگو دینی مدارس کے مزاج و مذاق، ان کے نصاب، ان کے طریق تدریس اور ان کے ماحول سے متعلق چار حصوں پر منقسم ہوگی۔ واللہ سبحانہ الموفق۔

دینی مدارس کا سب سے قیمتی سرمایہ اکابر سے ملا ہوا مزاج و مذاق ہے

برصغیر کے دینی مدارس کی سب سے قیمتی، سب سے گراں قدر اور سب سے اہم پونجی ان کا وہ مزاج و مذاق ہے جو انہیں اپنے اللہ والے اکابر سے ورثے میں ملا ہے۔ آج ہمارے دینی مدارس بنیادی طور پر دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چین اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کے خواہش مند ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت جو اسے دنیا کے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس کے اکابر کا مزاج و مذاق ہے جس میں علم کے رسوخ، مطالعے کی وسعت اور استعداد کی پختگی کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اپنی زندگی، اپنے ذہن و فکر اور اپنے جذبات و خیالات غرض ہر چیز میں سنت کے اتباع، سلف صالحین کی پیروی، اللہ تعالیٰ سے رجوع، اس کی طرف انابت اور اسی کی رضاء جوئی کی فکر تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد علم و عمل کے سنگھم پر اٹھائی گئی تھی

دنیا میں مختلف علوم و فنون پر دادِ تحقیق دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی اور نرے ”علم“ کی حد تک تحقیق و تدقیق کے شناور دوسری معاصر درسگاہوں میں بھی بہت ہوئے ہیں، لیکن دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی علم و عمل کے سنگھم پر اٹھائی گئی تھی اور اس میں جس قدر توجہ طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی، اس سے زیادہ ان کی عملی تربیت اور ان پر اسلاف کا

رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہاں دلوں میں خوف وخشیت کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال وحرام، بلکہ مکروہ ومستحب اور اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا صرف علم نہیں بلکہ ان کی عملی فکر اور ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں کی جاتی تھی۔ وہاں عبادات واطاعات کے علاوہ معاشرت، معاملات اور اخلاق کو سنت کے مطابق ڈھالا جاتا تھا۔ وہاں ایثار، تواضع، تحمل، بردباری، سادگی، اخلاص اور للّٰہیت کے ملکات پیدا کیے جاتے تھے۔ وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھادی جاتی تھی کہ علم برائے علم اس کا مطمحِ نظر نہیں اور نہ تحصیل علم کا مقصد مال وجاہ کا حصول ہے بلکہ اصل مقصد اپنے آپ کو اعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اور اس کے بعد انہی اوصاف کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔

تمام عظیم شخصیات بزرگوں کی تربیت یافتہ تھیں

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے س دور میں جب وہاں سے برصغیر بلکہ عالم اسلام کی تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں ہر ہر طالب علم کا یہ لازمی معمول تھا کہ وہ صرف کتابیں پڑھنے پر اکتفا کرنے کی بجائے کسی نہ کسی مصلح یا مربی سے اصلاح وتربیت کا خصوصی تعلق قائم کرتا تھا اور شاید ہی کوئی فارغ التحصیل طالب علم ایسا ہو جو فراغت کے فوراً بعد کسی نہ کسی مربی سے باقاعدہ رجوع نہ کرتا ہو اور اس کی صحبت وتربیت سے صیقل ہوئے بغیر عملی میدان میں آجاتا ہو۔ آپ کو علماء دیوبند میں جتنی عظیم شخصیات نظر آئیں گی وہ سب کسی نہ کسی شیخ کی تربیت یافتہ اور ان کی صحبت وخدمت سے فیض یاب تھیں۔

ہمارے مدارس میں اکابر کے مزاج ومذاق کی کمی آگئی ہے

لیکن کچھ عرصے سے ہمارے دینی مدارس میں اس مزاج ومذاق کی بے حد کمی آگئی ہے، اب صرف کتاب کے پڑھنے پڑھانے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے اور اصلاح اعمال واخلاق کی طرف توجہ باقی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مدارس کی عملی زندگی میں جائز وناجائز اور مکروہ ومستحب کی فکر رفتہ رفتہ مفقود ہو رہی ہے۔ پہلے مدارس کے مہتممین اور اساتذہ کا حال یہ تھا کہ وہ مدرسہ کے پیسوں اور اس کی املاک کو پھونک پھونک کر استعمال کرتے تھے کہ کہیں حدود

سے تجاوز نہ ہو جائے۔ان کو اپنی آمدنی بڑھانے کی بجائے اس بات کی کفر دامن گیر رہتی تھی کہ جو تنخواہ ہم وصول کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے حلال بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ لوگوں نے اپنی تنخواہیں بڑھانے کی نہیں، کم کرنے یا کٹوانے کی درخواستیں دی ہیں۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی گائے ایک مرتبہ کسی نے مدرسے کے صحن میں لاکر باندھ دی، کسی شخص نے اعتراض کیا تو حضرت مولانا نے اس کی جواب دہی کے بجائے وہ گائے ہی صدقہ کر دی۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر سیکڑوں افراد کے کھانے کا انتظام کرتے لیکن خود کبھی مدرسے کے کھانے میں شریک نہ ہوتے اور جب رات گئے انتظامات سے فارغ ہوتے تو اپنے گھر سے لایا ہوا ٹھنڈا سالن ایک کونے میں بیٹھ کر کھا لیتے تھے۔اسی مدرسے کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کو کبھی مطبخ کی کارکردگی کے معائنے کے لیے کھانا چکھنا ہوتا تو پہلے ایک خوراک خریدتے اور پھر چکھ کر باقی سالن واپس کر دیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ، مہتممین اور طلبہ کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے لیکن جب آج ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو بزرگوں کے اس طرز عمل کے ساتھ کوئی دور کی نسبت بھی نظر نہیں آتی۔غنیمت ہے کہ ابھی ظاہری وضع قطع اور کسی درجے میں عباداتِ واجبہ کی حد تک اتباع کا کچھ اہتمام مدارس کے اندر باقی ہے (اور بعض جگہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے) لیکن اتباع سنت اور احتیاط وتقویٰ کسی ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ معاشرت، معاملات اور اخلاق ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہے اور خاص طور پر ان شعبوں میں تدین وتقویٰ اب ہمارے درمیان نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

کوئی مادہ پرست کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کا مدرسے کے مقاصد پورے ہونے اور اچھے طلبہ کی پیداوار سے کیا تعلق ہے؟ لیکن ہم جو اکابر علماء دیوبند کے نام لیوا ہیں، ان باتوں کو مدرسے کی کامیابی اور ناکامی سے بے تعلق قرار نہیں دے سکتے۔ان مدارس کی بنیاد اخلاص،

للّٰہیت اور تقویٰ پر ہے اور اس بنیاد میں جتنی کمزوری آئے گی، اوپر کھڑی ہونے والی عمارت، ظاہری اعتبار سے خواہ کتنی خوشنما ہو، لیکن نتائج وفوائد کے لحاظ سے اتنی ہی کمزور ہوگی۔

مدارس کی اصل روح کا احیاء اور اس کے لیے چند تجاویز

لہٰذا مدارس کے نصاب ونظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مدارس کی اس روح کے احیاء کی فکر کی جائے۔ اس روح کے احیاء کا تعلق اصل میں تو اہل مدارس کی قلبی لگن سے ہے لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

۲۔ اساتذہ وطلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں۔ اس میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی ارواح ثلاثہ، تذکرہ الرشید، حیات قاسمی، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہندؒ، اشرف السوانح اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی ''آپ بیتی'' کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

۳۔ ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لیے کسی شیخِ طریقت سے باقاعدہ اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں ان کے اس پہلو کو بطورِ خاص نظر میں رکھا جائے۔

۴۔ جس مدرسے کے قریب کوئی صاحبِ ارشاد بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت وخدمت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں اور کبھی کبھی مدرسے میں ان کے اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

امید ہے کہ اس قسم کے اقدامات سے ان شاء اللہ مدارس کی فضا بہتر ہوگی اور ہم اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جارہے ہیں، اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت

احمد جاوید[1]

سماجی علوم اور دینی تقاضے (آخری قسط)

سماجی علوم کی اسلامی تشکیل نو مسلم اہل علم پر فرض ہے

مثال کے طور پر فلسفے کو لے لیں، سوشل سائنسز میں کلاسیکل hierarchy کے مطابق روایتی نظام مراتب کے مطابق سوشل سائنسز میں سب سے بڑی حیثیت فلسفے کی تھی، جو اب نہیں رہی، لیکن بہر حال سوشل سائنسز بلا استثناء فلسفے کی ذیلی شاخیں (offshoots) ہیں اور نیچرل سائنسز بھی، یعنی یہ فزکس وغیرہ بھی پہلے فلسفے کے شعبے تھے۔ اگر ارسطو کو آپ پڑھیں تو اس میں سائنسی علوم بھی فلسفے کے شعبے تھے، نفسیاتی علوم بھی فلسفے کے شعبے تھے۔ تو فلسفے کا مقصود یہ تھا کہ اس کائنات کی ایک مشترک حقیقت یقیناً ہے اس کائنات کی حقیقت واحدہ یقیناً ہے، لیکن اس حقیقت واحدہ کا تجربی شعور ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اس حقیقت واحدہ پر عقلی دلائل وضع کیے جا سکتے ہیں لیکن اس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو فلسفے کا اصل موضوع یہ تھا کہ اس حقیقت واحدہ کے اثبات کے لیے قائل کر دینے والے دلائل ایجاد کرے اور ان دلائل میں اتنی شدت پیدا کرے کہ اس حقیقت واحدہ کے تجربی مشاہدے کی خواہش غائب ہو جائے۔ یہ فلسفے کا اصل مقصد تھا، یعنی فلسفے کے آغاز سے، تو وہاں بھی اگر آپ دیکھیں یعنی کلاسیکل فلسفے کو اور سقراط وغیرہ سے پہلے کے فلسفہ کو، ہندوستان کے فلسفے کو، اس میں آپ کو صاف نظر آئے گا کہ فلسفہ وحی کے نہ ہونے کے ماحول میں دین جیسا ہمہ گیر، ہمہ جہت ڈسکورس بننا چاہتا ہے۔ یعنی فلسفے کا مطلب ہے یونان کا فلسفہ، یونان کی تہذیب وحی سے جیسے خالی تھی، جب فلسفہ پیدا ہوا فلسفہ گویا شعور کی ایمانی خواہشات کو عقل کی کمک لے کر پوری کرنے کا نام تھا۔ اس کے بعد اس کلاسیکل فلسفے پر ڈیکارٹ نے ضرب لگائی، اس نے مابعد الطبعیات اور مادے کو ایک دوسرے سے منقطع کر کے ان دونوں کے لیے درکار دلائل کو ایک دوسرے پر غیر مؤثر کر کے شعور کے دو حصے کیے اور کہا کہ خدا کو خدا کی طرح مانو چیزوں کو خدا کے حوالے سے ماننا چھوڑ دو، نہ چیزوں

---

[1] معروف دانشور، فلاسفر اور مربی

میں خدا کو دیکھو نہ خدا سے چیزوں کو جوڑ کے دیکھو۔ یہ ہے اس کے فلسفے کا خلاصہ۔تو فلسفہ ایک کُل تھا اس کے اندر ڈیکارٹ نے دھماکہ کر دیا۔ اندر دھماکا ہونے کے بعد اس کل کے تمام اجزاء اس سے منحرف ہوتے چلے گئے۔ یہ ہے جدید دنیا اور جدید سماجی علوم جو فلسفے کے کُل میں ڈیکارٹ اور ہیوم کی طرف سے کیے گئے دھماکوں کے نتیجے میں اس کے منحرف اجزاء کی حیثیت سے اپنی الگ الگ حیثیتیں بنانے میں اور منوانے میں کامیاب ہو گئے۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ اس وقت کائنات کی کسی حقیقت واحدہ کی کوئی بھی جستجو کسی بھی علم کا موضوع نہیں ہے۔ موجودہ صورتحال میں حقیقت اور صورت کے اصطلاحوں سے پیدا ہونے والے ذہن کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس میں میٹا فزیکل حقائق کو مان لینے، مان سکنے کی کوئی گنجائش، کوئی اجازت نہیں ہے۔ اس میں جو کچھ ہے، وہ فزیکل ہے یا psychic ہے۔ یہ بات میری دانست میں ایسی ہے جو ممکن ہے کہ کتابوں میں پڑھنے میں دیر لگے تو اس کو میں تھوڑا سا اور واضح کر دوں کہ ہماری تشخیص یہ ہے کہ ذہن کو مابعد الطبیعیات، یا ہم اپنی اصطلاح میں کہیں تو ایمانی تناظر سے عاری کرنے کے بعد، کیونکہ ذہن کی میٹا فیزیکل امنگوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا، تو اس کے اس شور سے، اس آواز سے بچنے کے لیے جہاں ذہن مابعد الطبیعی حقائق کو طلب کرتا ہے، اس آواز سے بچنے کے لیے انہوں نے نفسیات اور تھیوری آف پرسیپشن کا سہارا لیا۔

اب آپ ان کا دجل دیکھیے کہ یہ جو شعور ہے، وہ خدا کے حضور میں رہے بغیر چیزوں کو اپنے علم کا حصہ بنا ہی نہیں سکتا۔ یہ ذہن کی فطرت ہے کہ اگر خالق کائنات کا حضور اگر پہلے سے اسے میسر نہ ہو تو وہ کائنات کے بارے میں کسی بھی علم کی صحیح یا غلط تعبیر یا تشکیل نہیں کر سکتا۔ تو انہوں نے ذہن کو اس کی فطرت سے ہٹانے کی کاوش کی ہے۔ اس کاوش کو اب نئے ذہن کی تعمیر میں صرف کرنے اور ذہن کو اس کی فطرت اصلی سے ہٹانے کے لیے جہاں وہ کہتا ہے، خدا کہاں ہے، جس کی مدد سے مَیں چیزیں ڈیفائن کروں؟ خالق کائنات کہاں ہے، جس کی مدد سے مَیں کائنات کے میکینکس کو سمجھوں، وہ ہدایت کہاں ہے جو مجھے اس نظام فطرت کے سمجھنے کو، حقیقت کو جاننا ممکن بناتی ہے، تو اس کے لیے انہوں نے علم نفسیات میں نظریاتی جہتیں پیدا کی ہیں۔ یہ بات جو مَیں کہہ رہا ہوں میرے خیال میں اس بات پر ہمیں غور کر کے اور اس سے مطابقت رکھنے والے مواقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے شعور کے تمام مابعد

الطبیعی تقاضوں کو اس کی لاشعوری سرگرمیاں قرار دے دیا۔ یعنی نفسیات نفسیات کسے کہتے ہیں، جدید نفسیات کی کیا تعریف ہے؟ جدید نفسیات نام ہے جبلت (instinct) اور شعور میں تعلق کی قسمیں اور ان کی تاثیرات دریافت کرنے کا کہ کچھ محرکات ہیں جن سے میری طبیعت کے پسند ناپسند کا مزاج تشکیل پاتا ہے۔ کچھ جبلتیں ہیں جو میرے وجود کے حیوانی عنصر کے قیام کے لیے ضروری ہیں، ان جبلتوں کا میرے شعور کی بلند سطح یعنی میرے ذہن اور شعور سے پریکٹیکل اور فنکشنل ایفیکٹیو تعلق کیا ہے؟ اس کے جواب کو نفسیات کہتے ہیں۔

جدید فلاسفہ نے یہ کیا کہ جتنی شعور میں گونج تھی کہ خدا ہے، مالک ہے، خالق ہے، معبود ہے، اس گونج سے ذہن کے کان کو بہرا کرنے کے لیے انہوں نے ذہن کو سکیڑ دیا اور شعور کو اس کی فطری ساخت میں لاشعور قرار دے دیا۔ لاشعور کا مطلب یہ ہے کہ جس کے contents کی مدد سے آپ کسی علم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ جس کے contents آپ کے تخیل کی تشکیل میں تو استعمال ہو سکتے ہیں لیکن لاشعور میں موجود چیزوں کو جوڑ کر آپ کوئی حقیقی علم اور واقعی دانش تخلیق نہیں کر سکتے۔ یہ علم کہلانا کوالیفائی نہیں کرتا۔ تو اب آپ اس دھوکے کو دیکھیے اور اس کے مقابلے میں اپنی ذمہ داریوں کو دیکھیے کہ انہوں نے شعور کی خدا طلبی، شعور کی آخرت خوئی، شعور کے اندر فطرت میں رکھا ہوا ملکہ خدا شناسی انسانی ذہن سے لاتعلق کر دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

آج ہمارے کسی بھی نظریے، دنیا کے بارے میں علم اور تصور کے بننے کا سارا عمل مغرب کے مادہ علم سے عمل میں آتا ہے، تشکیل پاتا ہے، تو یہ کتنی بڑی نالائقی و نااہلی ہے، کتنی بڑی غفلت ہے میری، کہ انسانی وجود اور شعور دونوں کو سیراب کرنے والا پانی مغرب کے چشمہ زہراب سے آتا ہے یعنی مغرب کا جوز ہراب کا چشمہ ہے اس سے تم اپنے شعور کے درختوں اور پودوں کو پانی دے رہے ہو اور اگر ہم لوگ اس سے نہ نکلے اور اس سے نکلنے کی بہت منظم کوششیں نہ کی تو پھر ہمارے شناختی کارڈ والے اسلام کے علاوہ کوئی مسلمانی باقی نہیں رہے گی۔

ہمارے شعور کا جو ایمانی ڈیٹا ہے، اس کے تخیل کا حصہ ہے، اس کے خوابوں کا حصہ ہے، اسے اس کی بیداری سے کوئی تعلق نہیں۔ لاشعور کا مطلب ہے سویا ہوا شعور، جو خواب دیکھ رہا ہے۔ تو سوئے ہوئے شعور کے خوابوں کو بیداری سے غیر متعلق شعور کی بیداری سے غیر متعلق کرنے کی جو انہوں نے ایسی کوشش کی، جس کی بنیاد پر ان کی موجودہ تہذیب اور موجودہ ذہن

کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے، اب وہ اس پورے مزاج کو، اس پوری perception کو، اس پوری مصنوعی حالت کو مسلط کر رہے ہیں، اپنے علوم کے ذریعے، اپنے مختلف نظاموں کے ذریعے سے، اپنی طاقت کے ذریعے سے، اپنے آپ کو ہر اعتبار سے ناگزیر اور پرکشش بنا لینے کے ذریعے سے، وہ ہمیں اس طرف کھینچ رہے ہیں کہ ہم بھی اپنے ایمانی شعور کو لاشعور کے قبضے میں دے کر اس کی امنگوں سے، اس کے مسلمات سے، اس کے معتقدات سے فارغ، بے نیاز اور غافل ہو جائیں۔

یہ صرف نفسیات کا معاملہ نہیں رہا، لسانیات بھی اس کے لیے استعمال ہو رہی ہیں جو اس وقت فلسفے کی آخری پناہ گاہ ہیں۔ فلسفے کو فزکس وغیرہ نے دیس نکالا دے دیا، اب مغرب میں فلسفے کی آخری پناہ گاہ لسانیات ہی ہے۔ لسانیاتی فلسفہ باقی رہ گیا، باقی فلسفی اچکوں کی طرح کام کر رہے ہیں، کچھ اِدھر سے، کچھ اُدھر سے لے کر وہ اپنا کام چلا رہے ہیں۔ فلسفہ مغرب میں بھی عالم نزع میں ہے۔

لسانیات میں آپ دیکھیں، انسانی ذہن اور اس کے نظریے کا تعلق بالکل اسی انداز کا ہوتا ہے، جس انداز کا تعلق لفظ اور اس کے معانی میں ہوتا ہے۔ انسانی ذہن اپنے نظریے اور مسلمے اور عقیدے کو اسی طرح محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح contain کرتا ہے، جس طرح contain کرنے کی عادت لفظ کی ہے، یعنی لفظ جس طرح معانی کو اپنے اندر رکھتا ہے، انسانی ذہن ایسے ہی اپنے حقائق کو contain کرتا ہے۔ اگر لفظ میں معانی کا وجود مشتبہ قرار دے دیا جائے، اگر لفظ اور معانی کے سارے تعلق کو فرضی اور خیالی مان لیا جائے، تو اس کے نتیجے میں لامحالہ یہ ماننا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ذہن اور اس کے عقیدے کا تعلق بھی فرضی ہے، اضافی ہے۔ اگر آپ لفظ میں موجود معانی کو یہ کہہ رہے ہیں، کہ یہ لفظ کے ساتھ نسبت رکھنے میں مفروضے کی طرح ہے، یعنی معانی لفظ کے لیے ایک مفروضہ ہے، ویسے ہی آپ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ ذہن کے لیے اس کا ایمان، اس کا عقیدہ ایک مفروضہ ہے۔

وہ لوگ بہت ظلم کر رہے ہیں، جو ہماری دینی وضع قطع کو قانونی بحثوں میں ڈال کر بے کشش بنا رہے ہیں، غیر ضروری بنا رہے ہیں۔

آج کل ادب اور فلسفہ کے قارئین deconstruction کی تھیوری سے ضرور واقف

ہوں گے۔ ایک فلسفی گزرا ہے حال ہی میں، دریدا، اس نے یہ تھیوری پیش کی ہے۔ اس تھیوری کا ایک حصہ ہے suspension of meaning، یعنی معنی کا تعطل۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ہم جو چیز بھی لفظ یا کسی بھی indicator سے اخذ کرتے ہیں، وہ معانی نہیں ہوتے، بلکہ معانی کی طرف اشارہ کرنے والی کچھ قابل ادراک چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ معانی کی فرضی صورتیں ہوتی ہیں، معانی ہمیشہ معطل رہتے ہیں، ہمیشہ suspended رہتے ہیں، معانی نہ کبھی لفظ کی تحویل میں آتے ہے نہ کبھی ذہن کے قبضے میں آتے ہیں۔ اب آپ یہ سوچیے کہ یہ کتنی گہری ضرب ہے اس ذہن پہ، جو یہ کہتا ہے کہ میرے لیے میرے معانی حقیقی اور یقینی ہیں اور جو یہ جانتا ہے کہ لفظ جن معانی کو express کر رہا ہے، وہ مفروضے نہیں ہیں، حقائق ہیں۔

اس کے علاوہ آپ معاشیات میں چلے جائیں، اخلاقیات میں چلے جائیں، آپ کسی بھی پہلو سے کسی بھی سوشل سائنس کو دیکھ لیں، آپ کو واضح لگے گا کہ ان لوگوں نے ایک منصوبے کے طور پہ دینی ذہن کو شعور کی اقلیم سے خارج کر دینا ٹھان رکھا ہے۔ تو ایسی نامساعد، ناموافق اور ناسازگار علمی صورتحال میں ہم سب کا یہ اجتماعی فریضہ ہے کہ ہم اپنے ایمان کو اپنے شعور کا منبع اور مرجع بنا کر دکھائیں، ہم اپنے ایمان کو اپنے علوم کا ماخذ اور علوم کا مقصود بنا کر دکھائیں۔ ہم اپنے تصورِ علم کو اس طرح عمل میں لا کر دکھائیں، جس میں غلطی سے ڈرنے کی ضرورت نہ ہو۔ کیوں نہ ہو؟ کیوں کہ اس کی مقصود صحت مجھے حاصل ہے۔ جیسے مَیں نے عرض کیا، کہ ہر چیز خدا کی نشانی ہے۔ یہاں ہر شے کا علم اس کی حقیقت سمیت مکمل ہو گیا۔ اب اس کی صورت کے تجزیے میں دو آدمی مختلف ہو سکتے ہیں، دونوں صحیح یا دونوں غلط ہو سکتے ہیں، وہ ثانوی بات ہے۔ تو سب سے پہلے ہمیں ایمان کا ام العلوم ہونا ثابت کرنا ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم چیزوں کو اس تعریف کہ ''ہر چیز خدا کی نشانی ہے'' کے سائے میں رکھ کر لائقِ علم بنائیں کہ یہ سب اللہ کی متعدد مختلف نشانیاں ہیں۔

تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور اخلاق میں فرق نہ رہے۔ جو علم اچھا آدمی نہ بنائے وہ علم نہیں اور جو علم ذہن کو حالت تسکین fulfilled حالت میں نہ رکھے، وہ بھی علم نہیں۔ تو طبیعت خیر کی بنیاد پر تسکین میں رہے، ذہن حق کے اثر پُرتسکین رہے، بس یہی علم ہے۔ جسے یہ دونوں حالتیں فراہم ہو جائیں، وہی علم ہے۔ تو یہاں کا تعلیمی نظام، تعلیمی مقاصد قابل رشک

ہیں۔ یہاں کی پروڈکٹس قابل رشک ہیں۔

تو میری گزارش ہے کہ آپ حضرات (شعبہ تعلیم کے منتظمین، مربی حضرات، سسٹمز کے مالکان) مہربانی فرما کر اپنے نصاب تعلیم میں، اپنے تدریسی عمل میں اس چیز کو بھی شامل کر لیں کہ ایمان کو تمام علوم کا مبداء واحد بنایا جائے، ایمانی شعور کو شعور کی دیگر تمام faculties کا مربی اور سرپرست بنایا جانا چاہیے۔

شعور کی کئی faculties ہیں۔ مذہبی شعور ہے، اخلاقی شعور ہے، جمالیاتی شعور ہے، عقلی شعور ہے، یہ کانٹ کی تقسیم ہے۔ اس میں ہم سب پہ لازم ہے کہ ہم اپنے ایمانی شعور کو جمالیاتی شعور کا بھی مربی بنائیں، عقلی شعور کا بھی رہبر بنائیں، اخلاقی شعور کا بھی کفیل بنائیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور اپنے ہر تعلیمی عمل میں اس ذمہ داری کو مقصود کے طور پہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ میرا جمالیاتی شعور بھی اللہ کے حضور سے سیراب ہو، میرا عقلی شعور بھی اللہ کے حضوری میں رہنے سے مانوس ہو۔ یہ ہم سب کے لیے بہت ضروری ہے۔

جیسا کہ سقراط نے کہا تھا کہ علم کے نتائج اگر اخلاقی نہیں نکلتے، تو وہ علم نہیں ہے۔ یہ بات سقراط سے کہیں زیادہ تیقن اور تحکم سے ہم کہہ سکتے ہیں، ہمیں کہنے کا حق ہے کہ علم کے نتائج اگر اخلاقی نہیں ہیں تو وہ دینی علم نہیں ہے کیونکہ دینی علم اللہ کے خوف سے شروع ہوتا ہے، اللہ کے خوف پہ تمام ہوتا ہے، اس کی محبت کو سمیٹ کر، اس کی معرفت کو سمو کر۔ بس اللہ ہم سب کو اس لائق بنائے کہ اگر ہم نے اپنی ذمہ داری کا صحیح احساس کیا ہے، تو ہم اسے مؤثر انداز میں عمل میں لانے کے لائق بن جائیں۔

اس موضوع سے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات

س: اللہ کی نشانی کا مطلب کیا ہے، یہ نشانی دیکھ کر ہر سائنسدان اللہ کو پہچانتا کیوں نہیں؟ ان کے درمیان کون سی کڑی غیر موجود ہے؟

ج: جس نے اپنے شعور کے اس حصے کو بیدار نہ رکھا، جو اسے اللہ کی طرف سے اپنی نشانیاں دیکھنے کے لیے ودیعت کیا گیا ہے تو وہ اللہ کی کھلی کھلی نشانیوں کو بھی دیکھنے کے لائق نہیں ہو سکتا۔ تو اگر کوئی سائنسدان، دہریے اور فلاسفہ چیزوں کو اللہ کی نشانی کے طور پہ نہیں دیکھتے، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے شعور کو اس کی فطری اصل سے ہٹا کر اسے اپنے اوپر حاکم بنایا ہے۔

س: کیا physical اور Biological سائنسز میں Ethics کو شامل کر کے مذہب کو replace کیا گیا ہے؟ مذہب سے شعور کو کس حد تک مطمئن کیا جا سکتا ہے؟

علم تصوف کو استعمال کیے بغیر جدید دین دشمن نفسیات کو رد کرنے میں مشکل پیش آئے گی، کیونکہ صوفیا نے انسانی نفس میں موجود جوہر بندگی کی گہرائیوں میں اتنی سیر کر رکھی ہے کہ ہمیں اسے رائیگاں نہیں جانے دینا چاہیے۔

ج: Ethics اور Physical سائنسز کے درمیان جو تعلق ہے، یہ جدیدیت کے بڑے منصوبوں میں سے ایک تھا کہ یہ سائنس کی بنیاد پر سائنسی تصور وجود کی بنیاد پر انسان اور اس کی دنیا، انسان اور اس کے نفس کے تمام مطالبات پورا کرنے کا بیڑا اٹھا رہے تھے، تو انہوں نے Ethics اور physics کا فرق، جو شاید لازمی تھا، فطری تھا، اسے ختم کر دیا تو Ethics بلاشبہ اپنی بعض حالتوں میں اصل میں نام ہی شعورِ تعلق اور جذبہ تعلق کی تعلیم کا ہے۔ Ethics کسے کہتے ہیں؟ اللہ نے مجھے اور آپ کو ایک نظامِ تعلق میں پیدا کیا ہے۔ اس نظام تعلق کے متعدد کردار ہیں اللہ سمیت، تو اس تعلق کو productive رکھنا، effective رکھنا، اس تعلق کو صحیح سمت میں برقرار رکھنا، یہ میری آپ کی ذمہ داری ہے، تو اس تعلق کو صحیح سمت میں، productive حالت میں برقرار رکھنے کی تدابیر کے مجموعے کو Ethics کہتے ہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ Ethics اگر اپنی فلسفیانہ حالت میں بھی ہو، تو وہ خدا تک پہنچنے کا ایک داعیہ ضرور پیدا کرے گا، ورنہ خدا تک نہ پہنچ سکنے کا قلق ضرور ہم میں منتقل کرے گا، لیکن جدید اخلاقیات ان دونوں اوصاف سے اس لیے خالی ہے، کہ جدید اخلاقیات organization کے اصول پہ کھڑی ہے، تعلق کے اصول پہ نہیں۔ تو جدید نظام تعلق organizational ہے، پورا مغرب organization کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسے نظام تعلق کو نہیں مانتا جو میرے قلب کی تسکین کرے، میری روح کو بالیدہ کرے اور میرے فطری اخلاقی مطالبات کی تکمیل کا وسیلہ بن سکے۔ جدید اخلاقیات دراصل سرمایہ دارانہ ایجنڈا میں سرمایہ دارانہ تنظیم کو برقرار رکھنے

کا ایک حربہ وحیلہ ہے۔ دل کی شمولیت کے بغیر کوئی اخلاق نہیں ہے۔ خدا کے تعلق اور دل کی شمولیت کے بغیر کوئی اخلاق نہیں ہے۔ تو انھوں نے خدا سے تعلق کو تو بالکل خارج کر دیا اور دل کو شامل ہونے سے روک دیا اور دل کے انکار کرنے کا ڈول ڈال دیا ہے۔

س: نفسیات کو رد کرنے میں علم تصوف کی مدد کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے اور کیا وہ اس بارے میں مفید ہوسکتا ہے؟

ج: علم تصوف کو استعمال کیے بغیر جدید دین دشمن نفسیات کو رد کرنے میں مشکل پیش آئے گی کیونکہ صوفیا نے انسانی نفس میں موجود جو ہر بندگی کی گہرائیوں میں اتنی سیر کر رکھی ہے کہ ہمیں اسے رائیگاں نہیں جانے دینا چاہیے۔ صوفیا کی انفسی بصیرت علماء کی انفسی معرفت سے بہت زیادہ ہے۔ تو ہمیں اسے کام میں لانا چاہیے، اس کی غلطیوں کو دور کرتے ہوئے، اس کے درست پہلوؤں کو قبول کرتے ہوئے اور قابل عمل بناتے ہوئے۔

سب سے بڑی بات تو یہ کہ ایک عقیدے پہ کھڑے ہو جائیں کہ انسان تعلق باللہ میں وفادار رہنے کے لیے، تعلق باللہ کے مادے سے پیدا ہوا ہے اور اس تعلق باللہ کے برقرار رکھنے کے امتحان سے گزرنے کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ نفسیات کے بڑے بڑے برج گرا سکتے ہیں، جب آپ یہ کہیں کہ انسان کی حقیقت بندگی ہے۔ انسان کوئی Bio Product نہیں، کوئی Rational being نہیں ہے۔ یہ سب ہے، مگر اس کا جو Umbrella Definition ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے۔ اس کے شواہد، نفسیات سے، احوال سے، شعور سے فراہم کریں، یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔

س: پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے کہا ہے کہ بارہ سو سال، یعنی چھ سو سال قبل مسیح اور چھ سو سال بعد مسیح میں سارے فلسفے آچکے تھے، بعد میں صرف اس کی تشریح ہے۔ یعنی پرانی شراب اور نئی بوتلیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

ج: آپ نام نہ لیتے تو اچھا تھا، لیکن بہر حال یہ بات درست نہیں۔ اگر آپ نام نہ لیتے تو میں اپنی بات کو مدلل کرتا۔

س: مسلمانوں میں بالعموم اور ان کے اہل علم میں بالخصوص یہ ذہن پایا جاتا ہے کہ جب

فلسفہ حالت نزع میں ہے تو پھر اسے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ کیا یہ ذہن درست ہے؟

ج: فلسفے کو اس رسی کی طرح نہیں پکڑنا چاہیے، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی اپنی طرف آنے والی رسی کو پکڑتا ہے۔ فلسفہ ہمارے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ فلسفہ تو ایسا ہے کہ جیسے دل گھبراتا ہے تو فلاں معجون کھالو، تو دل گھبرانا رک جائے گا۔ تو ذہانت بڑھانی ہو تو فلسفہ بھی پڑھ لو۔ ذہانت بڑھانے میں یہ معاون ثابت ہوتا ہے اور ذہانت کو بڑھانا بہرحال ایک دینی ضرورت ہے۔ تو فلسفہ سے ہم کوئی رہنمائی تھوڑی حاصل کرتے ہیں فلسفہ یوں سمجھیے کہ ہماری طبی ضرورت ہے۔

اگر ہم دو چیزوں پر علمی زور کے ساتھ اصرار کرنے کے لائق ہو جائیں تو ان شاء اللہ ہم ایمان اور علم کے درمیان گمشدہ کڑیوں کو پھر سے ڈھونڈ لیں گے اور وہ یہ کہ کائنات مخلوق ہے اور انسان کی حقیقت بندگی ہے۔

س: جو نوعیت آپ نے بیان فرمائی کہ سوشل سائنسز کو ایمان کے تابع کرنا ضروری ہے، تو کن خطوط پہ یہ کام ہوسکتا ہے؟ کچھ نکات؟

ج: یہی سب باتیں مَیں عرض کرنے کی کوشش کر رہا تھا، علم کہتے ہیں اپنے بنیادی تناظر perspective کو مفیدِ عمل بنالینا۔ اگر آپ کا بنیادی تناظر perspective ثابت ہو جائے اشیاء کی مدد سے، object کی مدد سے، تو وہ علم ہے۔ علم بنیادی تناظر پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے جنم لیتا ہے۔ کوئی بھی علم خلا میں نہیں پیدا ہوتا۔ ایک بنیادی perspective، شعور میں ایک بنیادی مقصود پہلے سے موجود ہوتا ہے، تمام علوم اس مقصود کو عمل میں لانے کے لیے، لائقِ حصول بنانے کے لیے، قابلِ تصدیق بنانے کے لیے وجود میں لائے جاتے ہیں۔

ہمارا بنیادی تناظر یہ ہے۔ موجودہ صورتحال میں اگر ہم دو چیزوں پر علمی زور کے ساتھ اصرار کرنے کے لائق ہو جائیں تو ان شاء اللہ ہم ایمان اور علم کے درمیان گمشدہ کڑیوں کو پھر سے ڈھونڈ لیں گے اور وہ یہ کہ ''کائنات مخلوق ہے اور انسان کی حقیقت بندگی ہے۔'' آپ اس اساس پر علوم پیدا کر کے دکھائیں تو علم کا پورا جدید ابلیسی سٹرکچر گر جائے گا جو انہی دو کے خلاف اعتقادات پہ کھڑا ہوا ہے کہ کائنات مخلوق نہیں ہے اور انسان فلاں فلاں وجود ہے۔

س: جو لوگ یہ (جدید) علوم پڑھتے ہیں، ان کے (اداروں کا) ماحول جس طرح مرعوب کن ہوتا ہے، تو ماحول کے غیر محسوس اثرات سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ کتابیں، افراد اور بعض اوقات ماحول اس سب کا کیا کیا جائے؟

ج: اگر اس کا کوئی علمی جواب مانگا جا رہا ہے، تو شاید مایوسی ہو گی۔ ایک عملی پہلو بتاتا ہوں۔

داڑھی لمبی کریں، کندھے پہ رومال رکھیں، عمامہ باندھیں اور کسی بھی انسٹی ٹیوٹ میں چلے جائیں، آپ غیر متاثر رہیں گے۔ وہ سب آپ سے ڈرے ڈرے رہیں گے۔ تو اسلام میں ایک روحِ فاروقیت بھی چل رہی ہے نا، کہ شیطان عمر رضی اللہ عنہ کے سائے سے بھاگتا ہے۔ بس عمر رضی اللہ عنہ کی سی وضع اختیار کر لیں۔

وہ لوگ بہت ظلم کر رہے ہیں، جو ہماری دینی وضعوں کو قانونی بحثوں میں ڈال کر بے کشش بنا رہے ہیں، غیر ضروری بنا رہے ہیں۔

میرے ایک دوست تھے احمد حسن مرحوم، بہت ذہین، ان کا سا ذہین اور ان کا سا متقی میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ وہ کینیڈا اور فرانس میں رہتے تھے اور وہاں دعوت کا کام کرتے تھے۔ دعوت کا منہج ان کا یہ تھا کہ کسی بھی شعبے کے کسی بھی بڑے آدمی سے پہلے وقت لیتے تھے اور اس کے بعد وہ پہلی کوشش یہ کرتے تھے کہ اس شعبے کے اس ماہر کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اپنے discipline میں کچھ نہیں جانتا، تو وہ اس سے یہ اقرار کروا لیتے تھے۔ فزکس والے سے ملے تو چار چھ ملاقاتیں کرنے کے بعد وہ یہ اعتراف کرنے کے قابل ہو جاتا تھا کہ "احمد حسن! تم بتاؤ فزکس کیا ہے؟"

تو اس طرح انھوں نے اس کلاس کے سینکڑوں لوگ مسلمان کیے۔ کینیڈا اور فرانس میں، اکیلے کام کرتے تھے۔ تو ان سے کسی نے پوچھا کہ وہاں آپ survive کیسے کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ یہی چپل، یہ اٹنگا پاجامہ، یہ کاندھے پہ دھرا رومال، یہی مجھے Survival کے لیے درکار ہے اور یہی میرے کام آ رہا ہے۔

جو حقیقت اپنی سٹینڈرڈ فارمز کو چھوڑ دے، وہ حقیقت اپنے dilute ہونے کا سامان کرتی ہے۔ اوضاع مذہبی کے تسلسل میں رخنہ ڈالنا، ان کے تعلق میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

تعلیم و تربیت پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ

صورتِ حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے

افغانستان میں طالبان حکومت نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم پر جو پابندی لگائی ہے اس کی حمایت یا مخالفت کرنے سے پہلے، ہماری رائے میں، ہمیں صورتِ حال پر معروضی انداز میں بعض زمینی اور دینی حقائق کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہم پاکستانی جو اس بحث میں حصہ لے رہے ہیں، ان کی اکثریت، شعوری یا غیر شعوری طور پر، پاکستان میں لڑکیوں کی تعلیم کو افغانستان کے حالات پر منطبق کرتی ہے۔ افغان حکمران کہہ رہے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہاں لڑکیوں کی تعلیم کا جاری رہنا غیر اسلامی ہے جبکہ پاکستانی یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم ”اسلامی“ ہے تو افغانستان میں یہ کیسے ”غیر اسلامی“ ہو سکتی ہے؟ لہٰذا پاکستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا پہلو بھی زیر بحث آنا چاہیے۔

۱۔ لڑکیوں کی تعلیم: پاکستانی تناظر

پاکستان میں لڑکیوں کی تعلیم خصوصاً ان کی اعلیٰ تعلیم کیا اسلامی ہے؟ بہت سے ’مذہبی لوگ‘ کہیں گے کہ یہ ’غیر اسلامی‘ ہے اور ’جدید تعلیم یافتہ‘ اور ’مغرب سے متاثر اذہان‘ کی اکثریت کہے گی کہ یہ ’اسلامی‘ ہے۔ تو لڑکیوں کی جدید تعلیم کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا معیار کیا ہے؟

دیکھیے! جس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ پچھلی دو اڑھائی صدیوں سے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب دنیا پر غالب ہے اور مسلمان اس دوران اس تہذیب کے علمبردار ممالک کے غلام رہے ہیں۔ مسلمان زوال کا شکار ہو چکے اور اسلامی فکر و تہذیب شکست کھا چکی۔ مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک اس تہذیب کی یونیورسلائزیشن کی بھرپور اور کامیاب کوششیں کر رہے ہیں اور اس کی مزاحمت کرنے والی ہر تہذیب کو پُرامن طریقوں سے اور اگر یہ نہ ہو تو قوت سے روند دینے اور کچل دینے پر مُصر ہیں۔ مسلم معاشرہ جب ڈیڑھ دو صدیوں تک اہل مغرب کا غلام رہا تو انہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سارے نظام کو منہدم کر دیا

(سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) اور مسلمانوں کی ذہن سازی اس طرح سے کی کہ وہ مغرب کے فکری غلام بن جائیں تاکہ عملاً بھی ہمیشہ ان کے غلام رہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان ممالک کی اکثریت بتدریج 'آزاد' ہوگئی لیکن کیا یہ مکمل آزادی ہے؟ کیا ہماری اشرافیہ اور ہمارا اجتماعی نظام (سیاسی اور عسکری قیادت، عدلیہ، بیوروکریسی، مقننہ اور ایگزیکٹو) بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقات (دانشور، صحافی، ادیب، وکیل، پروفیسرز، انجینئرز وغیرہ) کیا یہ مغرب کی الحادی تہذیب کی فکری غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا جواب مکمل ہاں میں دینا مشکل ہے؟

تو آج جب ہم سوچنے بیٹھتے ہیں کہ کیا پاکستان کا تعلیمی نظام اسلامی ہے یا اسی طرح کیا پاکستان کا سیاسی نظام، اس کا معاشی نظام، اس کا معاشرتی نظام.... اسلامی ہے؟ تو ہمارا جواب کیا ہوتا ہے؟ اور کیا ہونا چاہیے؟ کیا ہم غلامی کی ان دو تین صدیوں کو پھلانگ کر واپس جا کر سوچ سکتے ہیں جب ہم غالب تھے، ہماری فکر اور ہماری تہذیب غالب تھی، اُس وقت ہمارا 'اسلام' کیسا تھا اور چیزوں کو 'اسلامی' اور 'غیر اسلامی' کہنے کا معیار کیا تھا؟ اُس وقت اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی نظام معاشرت کیا تھا؟ اور وہ آج سے کتنا مختلف تھا؟

ہمارا مدعا یہ ہے کہ مغرب کی الحادی تہذیب کے غلبے نے ہماری سوچ کے پیمانے بدل دیئے ہیں۔ چیزوں کو اسلامی اور غیر اسلامی کہتے وقت ہم جو عینک پہنتے ہیں کیا اس کے شیشوں کا رنگ مغرب کا طے کردہ تو نہیں؟ کیا ہماری مثال اس بہو کی سی تو نہیں جو بدبودار کام کرنے والوں کے ہاں بیاہی گئی تو کہتی تھی کہ آپ کے ہاں بہت بدبو ہے۔ چند ماہ بعد پوچھا گیا تو کہنے لگی کہ کمال ہے، اب تو بدبو نہیں آتی۔ تو جناب! لارڈ میکالے نے ہمیں جو بدبودار نظام تعلیم دیا تھا اور انگریز نے ہمیں جو معاشرت دی تھی ان پر اب اتنا وقت گزر گیا ہے کہ اب ہمیں ان کی بدبو نہیں آتی۔ بدبو کہیں غائب نہیں ہوگئی وہ پہلے بھی تھی، اب بھی ہے۔ البتہ ہم اب اس کے عادی ہو گئے ہیں لہٰذا اب ہمیں بدبو نہیں آتی۔

اب جواب دیجیے کہ کیا ہمارا نظامِ تعلیم خصوصاً ہماری بچیوں کا تعلیمی ماحول اسلامی ہے؟ کیا ان کا نصاب ان کی صنفی ضروریات کے مطابق ہے؟ کیا یہ ان کو شرم و حیا سکھاتا ہے؟ کیا یہ ان کو ستر اور حجاب کے احکام بتاتا ہے؟ کیا یہ ان کو اپنے بچوں کی اسلامی تربیت کرنا سکھاتا ہے؟

کیا لڑکیوں کو انجینئرنگ، کمپیوٹر، بنک وغیرہ کی تعلیم دلانا اور ان سے دفتروں میں کام لینا فرض وواجب اور ضروری ہے؟ کیا ہماری یونیورسٹیوں کی مخلوط تعلیم اسلامی ہے؟ کیا یہ ہماری بچیوں کے اخلاق نہیں بگاڑ رہی؟ اگر آپ مغرب زدہ ذہن سے سوچیں تو ان باتوں میں کوئی برائی نہیں لیکن اگر آپ مغربی فکر وتہذیب کے غلبے کی عینک اُتار کر قرآن وسنت کی رو سے دیکھیں تو اسے اسلامی کیسے کہا جا سکتا ہے؟

جناب! یہ صدیوں پرانی بات نہیں، کل کی بات ہے کہ حکومت نے علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا۔ جب خطاب دینے کے لیے تقریب ہونے لگی تو انگریز حکومت نے اصرار کیا کہ لیڈی اقبال ساتھ آئیں۔ اقبال نے انکار کر دیا۔ جب حکومت نے اصرار کیا تو اقبال نے کہا اگر یہ شرط ہے تو اپنا خطاب اپنے پاس رکھو، مَیں نہیں آؤں گا، تو انگریز حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور یہ بھی ابھی کل کی بات ہے کہ روشن خیال عالم دین مولانا مودودیؒ نے کہا کہ عورتوں کی اسمبلی الگ ہونی چاہیے اور ایک اسمبلی میں عورتوں اور مردوں کو اکٹھے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ انہی مولانا مودودیؒ نے مخلوط تعلیم والی یونیورسٹیوں کو ’’قتل گاہیں‘‘ قرار دیا۔ اسی تعلیم کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ

اور یہ سین دکھائے گا کیا رنگ
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اور وہ رباعی بھی کہ ؎

بے پردہ کل جو نظر آئیں چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو مَیں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اور یہ بھی ابھی کل کی بات ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے دینی مدارس میں سے ایک کے سربراہ اور دینی قائدین کے سرخیل مولانا محمد یوسف بنوریؒ اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد آئے ہوئے تھے تو انہوں نے ٹیلی ویژن پر تقریر کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کیونکہ ان کی رائے میں یہ ’غیر اسلامی‘ تھا۔ تو تبدیلی یہ ہو رہی ہے کہ مغرب نے ہمارے معیار بدل دیئے ہیں۔ ہمارے چیزوں کو ناپنے کے معیار بدل گئے ہیں۔ جو چیز کل غیر اسلامی تھی، آج وہ اسلامی ہوگئی ہے، بقول اقبال ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

کیا مغرب نے تعلیم اور میڈیا کے ذریعے جو مادر پدر آزادی (لبرلزم) اور فیمنزم پھیلایا ہے جس میں عورت اور مرد کی مساوات اور ’میرا جسم میری مرضی‘ کے نعرے لگتے ہیں اور الیکٹرانک وسوشل میڈیا کے ذریعے فحاشی وعریانی پھیلائی جاتی ہے، ہم جنسیت کے فروغ کے لیے قانون سازی ہوتی ہے، نوجوانوں کے اخلاق تباہ کیے جاتے ہیں اور اسلامی معاشرت اور خاندانی نظام کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں۔ کیا یہ ہے وہ تبدیلی جو ہم انجوائے کرنا چاہتے ہیں؟ اور افغانستان کو بھی مشورے دے رہے ہیں کہ وہ بھی ہمارے راستے پر چلے۔ اور اگر وہ نہ چلے تو ہم اسے کٹھ مُلّائیت، دقیانوسیت، پسماندہ ذہن اور جمود کے طعنے دیں گے اور اس کی مذمت کریں گے؟

حقائق کی دنیا

اکنامک سروے آن پاکستان ۲۰۲۱ء میں پاکستان کے مختلف صوبوں میں شرح تعلیم کے مندرجہ ذیل تعلیمی اعداد وشمار ملاحظہ فرمائیے:

شرح تعلیم	مردوں میں	عورتوں میں	شہری آبادی میں		دیہی آبادی میں	
			مردوں میں	عورتوں میں	مردوں میں	عورتوں میں
پنجاب	72	57	80	72	67	48

سندھ	68	47	79	64	53	23
خیبر KPK	71	35	80	53	69	31
بلوچستان	61	29	76	47	55	22

آپ غور کیجیے اور اس سوال کا جواب دیجیے کہ خیبر پی کے اور بلوچستان میں اور خصوصاً اس کے دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی شرح تعلیم کم کیوں ہے؟ سندھ اور خیبر پی کے میں یہ مردوں سے نصف ہے اور بلوچستان میں ایک تہائی۔ اس کی وجہ جہالت پسندی اور ذہنی پسماندگی نہیں بلکہ یہ ہے کہ میدانی علاقوں اور شہری علاقوں کی بہ نسبت پہاڑوں میں رہنے والوں اور قبائلیوں میں روایت پسندی اور دین پسندی زیادہ ہوتی ہے بقول اقبال ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اور

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملّا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

بلوچستان اور خیبر PK کے قبائلی اور روایت پسند لوگ اپنی جوان لڑکیوں کو گھر سے دور کسی قصبے میں روزانہ اکیلے سکول بھیجنے یا بڑے شہروں میں ان کے تنہا رہنے اور لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کو معیوب سمجھتے ہیں نیز وہ مغرب زدہ جدید عصری تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ یہ تعلیم ان کی لڑکیوں کو آزادی اور سرکشی سکھاتی اور دین اور روایات کا باغی بناتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے اس رویے کو کس بنیاد پر انتہا پسندی قرار دے کر غلط کہا جائے اور اس کی مذمت کی جائے؟ اور اس حکومت کو کیوں انتہا پسند اور غلط نہ کہا جائے اور اس کی مذمت نہ کی جائے جو انہیں اسلامی اصول واقدار کے مطابق تعلیم دینے کی بجائے انہیں مغرب زدہ تعلیم دینے پر اصرار کرتی ہے؟ جو لڑکیوں کو تعلیم ان کی بستی میں مہیا نہیں کرتی یا انہیں سکول آنے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ مہیا نہیں کرتی اور جو اعلیٰ تعلیم کو اختلاط سے پاک نہیں کرتی؟

افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی

۱۔ اس پابندی کی ایک وجہ تو وہی ہے جو ابھی ہم نے پاکستان کے قبائلی عوام کے حوالے سے بتائی کہ وہاں کی حکومت لڑکیوں کو تعلیم ان کے گھر کے قریب اور اسلامی تناظر میں مہیا کرنے کے قابل نہیں۔

۲۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی مالی حالت ایسی ہے کہ حکومت کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں کہ وہ لڑکیوں کے سکول ہر گاؤں میں قائم کر سکے؟ یا ان کو ٹرانسپورٹ مہیا کر سکے یا ان کے لیے لڑکوں سے الگ کالج اور یونیورسٹیاں کھول سکے۔ ان کے پاس اتنی خواتین اساتذہ ہی نہیں جو سکول جانے کے قابل ساری بچیوں کو پڑھا سکیں اور اگر ایسی اساتذہ ہوں بھی تو ان کے پاس اتنے مالی وسائل ہی نہیں کہ وہ انہیں تنخواہ دے سکیں۔ طالبان کو اقتدار سنبھالے ابھی ایک سال ہوا ہے۔ امریکہ اور یورپ انہیں ناکام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اربوں ڈالر امریکہ نے دبا رکھے ہیں۔ اور ان کی مخالفت اور دباؤ کی وجہ سے دنیا کے کسی ملک نے انہیں ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔ طالبان حکومت کی اولین ترجیح لوگوں کو خوراک اور امن مہیا کرنا ہے۔ تعلیمی ترقی یا دوسرے شعبوں کی ترقی فی الحال مجبوراً ان کی ترجیح میں سرفہرست نہیں۔ مسلمان ممالک کو ان پر تنقید کرنے کی بجائے ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور ان کی مدد کرنی چاہیے کہ وہ تعلیمی ترقی کے لیے درکار اقدامات کر سکیں۔ مسلمان ممالک یہ تو نہیں کرتے لیکن ان کے دشمنوں کے پروپیگنڈے میں ان کا ساتھ ضرور دیتے ہیں کہ وہ لڑکیوں کو تعلیم کیوں نہیں دلاتے؟

پچھلے ماہ جب ہم تعلیمی دورے پر افغانستان گئے تھے تو وزیر تعلیم نے ہمیں بتایا تھا کہ افغانستان کے 417 اضلاع میں سے 200 اضلاع میں سرے سے کوئی سکول ہے ہی نہیں، نہ لڑکوں کا اور نہ لڑکیوں کا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے اشرف غنی عہد کی نصابی کتب کا جائزہ لیا ہے اور اس میں غیر اسلامی مواد کی نشاندہی بھی کر لی ہے لیکن ان کے پاس اتنے فنڈز نہیں کہ وہ نئی کتابیں طبع کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ لڑکیوں (بلکہ لڑکوں) کی تعلیم میں پسماندگی کی ایک بڑی وجہ طالبان کی معاشی تنگ دستی ہے۔ جوں جوں یہ دور ہوتی جائے گی، وہ تعلیم کے لیے زیادہ فنڈز مہیا کر سکیں گے اور لڑکیوں کی تعلیم کی حالت بھی بہتر ہوتی جائے گی، ان شاء اللہ۔

افغان طالبان کے کمزور پہلو

اس وقت تک ہم نے کچھ کہا، اسے یوں سمجھیے کہ ان امور میں گویا طالبانِ افغانستان کے لیے کچھ جواز کا یا عذر کا پہلو ہے۔ اب ہم ان کے کچھ کمزور پہلوؤں کا ذکر کریں گے جنہیں ان کے مخالفین اچھالتے ہیں۔ ہم پاکستان کے بعض دینی عناصر سے بھی اختلاف کرتے ہیں بلکہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں لیکن ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ تنقید نرم ہو کیونکہ اس تنقید سے مقصود ان کی تنقیص اور ہوا خیزی نہیں ہوتی بلکہ اس سے مقصود ان کی خیر خواہی، ان کی اصلاح اور صورتِ حال کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ طالبان حکومت پر سخت تنقید کرنے والوں میں مغرب زدہ لوگوں اور متجد دین کے علاوہ مخلصان دین کی ایک تعداد بھی موجود ہے، ان کی تنقید کی وجوہ آگے زیر بحث آئیں گی۔

i۔ اس بات میں وزن ہے کہ طالبان قائدین کی اکثریت پاکستان اور افغانستان کے دینی مدارس کی فارغ التحصیل ہے اور ان کا وژن خصوصاً تعلیمی وژن اتنا وسیع نہیں ہے۔ اگر آپ دینی مدرسہ کے ایک فارغ التحصیل کو اعلیٰ تعلیم یعنی یونیورسٹی تعلیم کا وزیر بنا دیں گے تو کیا وہ اس موضوع سے انصاف کر سکے گا؟ بلا شبہ اخلاص، تقویٰ، جذبہ، محنت، فراست اور بصیرت اپنی جگہ بہت بڑی خوبیاں ہیں (جو اکثر طالبان قائدین میں موجود ہیں اور جن کا پاکستانی معاشرے میں اور اس کے قائدین میں خاصا فقدان ہے) لیکن کیا یہ خوبیاں پیشہ ورانہ مہارت کا نعم البدل ہیں؟ ہم ایسا نہیں سمجھتے اور عقل و منطق کی رو سے کوئی بھی ذی عقل اس کی تائید نہیں کرے گا۔ طالبان نے آ کر سب کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا ہے اور خود سٹیئرنگ پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس سے درست سمت میں سفر کیسے طے ہوگا؟

ii۔ پتا نہیں فکری اور عملی آمریت ہمارے دینی عناصر میں کہاں سے آ کر بیٹھ گئی ہے؟ پاکستان میں بھی اور دیگر مسلم ممالک میں بھی ہر جگہ ان کا یہی حال ہے۔ ان سطور کے راقم کو دس سال تک پنجاب یونیورسٹی کے ’انسائیکلو پیڈیا آف اسلام‘ میں بطور محقق کام کرنے کا موقعہ ملا جس کے بانی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم تھے۔ وہ اُردو کے ادیب اور مناد تھے اور مولوی محمد شفیع مرحوم کے بعد اور اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد تا حیات اس ادارے کی صدارت کے فرائض انجام

دیتے رہے۔ ان کے اس قول کا مجھے وہاں جا کر علم ہوا اور مَیں اس کا ذکر اکثر کرتا رہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا اگر کسی شخص سے ۹۹ فیصد امور میں اختلاف ہو اور ایک فیصد میں اتفاق ہو تو مَیں اس ایک فیصد اتفاق یا اشتراک والے معاملے میں اس شخص کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دینی عناصر کا رویہ یہ ہے کہ اگر تمہارا ہمارے ساتھ سو فیصد اتفاق ہے تو تم ہمارے ساتھ کام کر سکتے ہو لیکن اگر تمہیں ہم سے ایک فیصد بھی اختلاف ہے تو پھر ہماری تمہاری راہیں جدا ہیں۔ پاکستان میں بھی دینی عناصر، دینی جماعتوں اور اداروں کا یہی حال ہے اور یہی حال افغان طالبان کا ہے کہ وہ اپنے 'تصورِ دین' کو حتمی اور قرآن کا حرف سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنے دورۂ افغانستان میں طالبان کو بھی ایسا ہی پایا۔ ہاں! انہوں نے اتنا ضرور کیا ہے کہ اختلاف کرنے والوں کو جیل میں نہیں ڈالا۔ انہیں خاموش رہ کر کام کرنے کی اجازت دی ہے لیکن اگر آپ ان کے تصورِ دین کے خلاف بولیں گے یعنی جس چیز کو وہ اسلامی یا مطابق اسلام سمجھتے ہیں اگر آپ نے اس سے اختلاف کیا تو پھر وہ آپ کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

دینی عناصر میں یہ فکری و عملی آمریت، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، پاکستان کے دینی عناصر میں بھی موجود ہے حالانکہ ان کے پاس اقتدار نہیں (اگر کسی دینی جماعت کو پاکستان میں اقتدار مل گیا تو وہ دوسرے دینی مسالک اور مکاتب فکر کا کیا حشر کرے گا اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے) اور یہ چیز طالبان حکمرانوں میں بھی موجود ہے۔ ہم نے جماعت اسلامی کے افراد کو، اہل حدیث اور بریلوی مسلک کے بھائیوں کو وہاں شکوہ کناں پایا کہ انہیں وہاں کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ طالبان حکومت ان سے نہ تعاون لیتی ہے اور نہ ان سے تعاون کرتی ہے۔

iii۔ تیسری چیز جو وہاں ہمارے مشاہدے میں آئی اور اندرون و بیرون افغانستان کے لوگ اس کے شاکی ہیں وہ یہ کہ وہ ابھی تک فکری طور پر (اور عملاً بھی) جنگی اور جہادی ماحول سے باہر نہیں نکلے۔ اس میں شک نہیں کہ افغان مجاہدین کو پہلے دس سال تک روسیوں سے لڑنا پڑا، پھر طالبان کو بیس سال تک امریکہ و یورپ سے لڑنا پڑا۔ جنگ و جہاد سے یہ طویل مصاحبت ان کے رگ و ریشے میں سما گئی ہے اور گویا ان کے مزاج اور معاشرت کا حصہ بن گئی ہے۔ لیکن دوسری طرف زمینی حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت ملک کے سیاسی حکمران ہیں اور

انہیں سِول انداز میں حکومت چلانی ہے۔ طالبان حکمران اگر اس نئ حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے اور اگر اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو نہیں بدلیں گے تو یقیناً وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مسائل کھڑے کریں گے۔

خلاصہ ان سطور کا یہ ہے کہ طالبان قیادت کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اگر وہ لڑکیوں کی تعلیم کو اس طرح نہیں دیکھتے جس طرح یورپ دیکھتا ہے یا جس طرح مغرب زدہ مسلمان ممالک دیکھتے ہیں (جیسے پاکستان، مصر، انڈونیشیا و دیگر مسلم ممالک) تو بھی ان کو لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام اس طرح ضرور کرنا چاہیے جس طرح وہ مناسب سمجھتے ہیں۔ چلیے اگر وہ یورپی و پاکستانی مسلمانوں کی نہیں سنتے تو ان کے اپنے ہاں بہت سے علماء ہیں جو لڑکیوں کی تعلیم کے حامی ہیں، وہ انہی کی سن لیں اور اس معاملے میں صرف اپنے ہاں کے سخت گیر عناصر کی ہی نہ سنیں۔ انہیں دوسروں کو تو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہمارے داخلی امور میں مداخلت نہ کرو لیکن وہ ان افغان علماء و اساتذہ کی تو سنیں جو ان کا حصہ ہیں اور جو لڑکیوں کی تعلیم، شرعی شروط و حدود و قیود کے ساتھ، دینے کے حق میں ہیں۔ اقول قولي هذا واستغفر الله لي وللمسلمين والحمدلله ربّ العٰلمين۔

بقیہ: افغانستان۔ ملا عمرؒ کی پالیسیوں پر اصرار

افغانستان میں موجود گروپوں کی تفصیل لکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کون کیا ہے اور کس کی اہمیت کیا ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا تو بات کو سمجھنا آسان ہو گا۔ اس وقت چونکہ افغانستان میں طالبان کی حکومت ہے تو ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوتی ہے۔ امریکہ افغانستان سے چلا گیا لیکن بات ختم نہیں ہوئی کیونکہ طالبان حکومت کو تسلیم کرنے کا کٹھن مرحلہ ابھی باقی ہے۔ دنیا طالبان حکومت کو اسی صورت قبول کرے گی جب وہ دنیا کے ساتھ چلنے کے تقاضوں پر پورا اتریں گے۔ اس حوالے سے دنیا طالبان کا بغور مشاہدہ کر رہی ہے۔ طالبان کو گروہ بندیوں سے نکل کر بہت کچھ ثابت کرنے کی ضرورت ہے مگر مستقبل قریب میں ایسے آثار دکھائی نہیں دیتے کہ طالبان کے سخت گیر مؤقف میں تبدیلی واقع ہو گی یا افغانستان سے عسکری گروپوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ (روزنامہ دنیا)

تعلیم و تربیت پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

تعلیم و تربیت اور قومی خدمت

قاسم علی شاہ صاحب کی خدمت میں

اصل چیز قوم کی تعلیم و تربیت ہی ہے

جب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے تعلیم و تربیت سے اپنے مشن کا آغاز کیا تو ہم اس کی تحسین کرتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ یا اللہ انہیں اس روش پر قائم رکھنا۔لیکن جب ان کا حلقۂ معتقدین ذرا وسیع ہوا اور چار پیسے آ گئے تو آپ سیاست کی نذر ہو گئے۔ بعد از خرابی بسیار وہاں سے واپس آئے لیکن اب تک ان پر مسلک کا رنگ اتنا غالب آ چکا تھا اور ان کا سیاسی امیج اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ وہ پہلے والی بات نہ رہی۔ پھر جب عمران خان صاحب نے تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تو ہم کوشش کر کے زمان پارک ان سے ملنے گئے اور انہیں کہا کہ اس کام کو چھوڑ یے گا نہیں کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ انہوں نے اس کی حامی بھری لیکن چند ہی مہینوں بعد انہوں نے تعلیم کو چھوڑ کر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا اور آج تک واپس نہیں پلٹ سکے۔

یہ باتیں کل ہمیں یاد آئیں جب ہمیں قاسم علی شاہ صاحب کا ایک ویڈیو کلپ دیکھنے کا موقع ملا جس میں انہوں نے فرمایا کہ وہ بنیادی طور پر استاد ہیں۔ انہوں نے ایک ٹیوشن سنٹر اور اکیڈمی سے کام کا آغاز کیا اور پھر ترقی کر کے اسے ’’قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن‘‘ بنا دیا جس میں ان کے بقول اس وقت تعلیم و تربیت کے کئی شعبوں میں سو سے زیادہ آدمی کام کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب ایک موٹی ویشنل سپیکر کے طور پر مشہور ہیں اور اسلامی اقتدار کی بھی بات کرتے ہیں۔ ان کے بقول وہ ملک کے اعلیٰ ترین تعلیمی و تربیتی اداروں میں برسوں سے تعلیم و تربیت (ٹریننگ) کا کام کر رہے ہیں۔ مستحق طلبہ کو سکالرشپ مہیا کرنے کے لیے بھی وہ کام کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا میں ان کے فالورز کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ بہت سے کھاتے پیتے اور صنعتکار بھی ان کے حلقۂ اثر میں ہیں لہٰذا اب انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ’’قاسم علی فاؤنڈیشن‘‘ کو بھی چھوڑ دیں گے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر قوم کو اچھی قیادت مہیا کرنے کے لیے کام کریں گے۔ یہ کام بظاہر سیاسی ہے لیکن ابتداءً انہوں نے کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں دیا اور نہ سیاسی

جماعت بنانے کا اعلان کیا ہے۔ غالباً یہ کام شاید مزید آگے جانے کے بعد ہوں گے، فی الحال وہ صاف ستھری قیادت مہیا کرنے اور خصوصاً نوجوانوں کو متحرک کرنے اور ساتھ ملانے کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے سیاست کوئی بری چیز نہیں اور نہ یہ غیر اہم ہے کہ ہم قاسم علی شاہ صاحب سے یہ گزارش کریں کہ وہ اس وادیٔ پُر خار میں نہ اتریں۔ بلاشبہ ہماری سیاست بڑی حد تک Derail ہو چکی ہے۔ اسے اسلام، نظریۂ پاکستان اور تعمیری اصول واقدار کی طرف واپس لانا بہت اہم اور ضروری ہے۔ اسے دینی فرقہ واریت اور سیاسی پولرائزیشن کے چنگل سے نکالنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تاہم اس کے باوجود ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ ’’قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن‘‘ کو چھوڑنے یا اس سے آگے بڑھ کر کام کرنے کی بات تو کریں لیکن یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ اگر قومی زندگی میں کوئی پائیدار اور مثبت تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو یہ کام بھی تعلیم وتربیت ہی کا ہے۔ افراد سازی کا ہے۔ اچھے لوگوں کو اکٹھا کرنے اور ٹیم بلڈنگ کا ہے اور یہ کام نظری بنیاد پر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے ہمارا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ لہٰذا جو مہم انہیں درپیش ہے وہ درحقیقت قوم کی تعلیم وتربیت کی ہے، اس میں سے خیر چھانٹنے کی ہے۔ نیک اور صالح لوگوں کو اکٹھا اور منظم کرنے کی ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، اقتدار مل بھی جائے تو اچھے نتائج نہیں نکل سکتے۔ جیسا کہ عمران خان ساڑھے تین سال کے دورِ اقتدار میں کچھ خاص ڈیلیور نہ کر سکے کیونکہ ان کے پاس نظریاتی طور پر آزمودہ ٹیم موجود نہ تھی۔ اس وقت جو لوگ اسمبلیوں میں ہیں ان میں بہت بڑی اکثریت اس کی اہل ہی نہیں ہے، نہ ان میں اس کام کی اہلیت ہے اور نہ صلاحیت۔ کرپٹ سیاسی نظام کی وجہ سے اور دولت و برادری کی وجہ سے وہ الیکٹیبلز بنے ہوئے ہیں اور جو شرفاء باصلاحیت ہیں انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ ظاہر ہے جب تک اس نظام کی اصلاح نہ ہوگی کوئی پائیدار اور مثبت تبدیلی نہیں آسکے گی۔

خلاصہ ہماری گزارش کا یہ ہے کہ قاسم علی شاہ صاحب اگر قومی سیاسی اصلاح کے لیے اٹھے ہیں تو ہم انہیں اس علو ہمت پر داد دیتے ہیں لیکن انہیں اس امر کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس کام کی بنیادی ضرورت قوم کی نظریاتی تعلیم وتربیت ہے لہٰذا وہ صرف سیاسی جدوجہد کا نقشہ نہ بنائیں بلکہ اس بات پر بھی غور کریں کہ موجودہ سیکولر سیاسی جماعتیں اور دینی سیاسی جماعتیں

ڈیلیور کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں؟ ہماری دانست میں قوم کی نظریاتی تعلیم وتربیت اور یہ کام کرتے ہوئے ان میں سے اہل افراد چھانٹتے جانا اور انہیں ایک مضبوط یکسو نظریاتی ٹیم میں بدلنا پاکستان میں مثبت اسلامی تبدیلی لانے کے لیے ناگزیر ہے۔ اور یہی چیز مسلمانوں کو دنیا وآخرت میں کامیاب کرسکتی ہے۔

اگر شاہ صاحب پاکستان میں تعلیم وتربیت کا کام اسلامی تناظر میں کرنا چاہیں تو ہماری خدمات بھی ان کے لیے حاضر ہیں۔ ''تحریک اصلاحِ تعلیم'' طویل برسوں سے تعلیم وتربیت کی اسلامی تشکیل نو کے لیے کام کررہی ہے۔ اس موضوع پر دیگر سرگرمیوں کے علاوہ ہماری پندرہ (۱۵) تصانیف اور ایک ماہنامہ ''البرہان'' موجود ہے اور ہمیں ان سے تعاون کرکے خوشی ہوگی۔

بقیہ: پاک افغان تعلقات میں امریکی کردار

حل تو اس کا ممکن ہے لیکن اس پر عمل کون کرے؟ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کی فکری غلامی سے نکلا جائے اور اپنے نظریۂ حیات سے مضبوط وابستگی اختیار کی جائے۔ معاشی مسئلے کا حل بھی یہی ہے کہ اس میں بھی مغرب کی غلامی سے نکلا جائے پلانڈ ڈیفالٹ (Planned Default) کیا جائے، سودی نظام ختم کیا جائے، درآمدات اور شاہی اخراجات پر پابندی لگائی جائے۔ اسلام کی دیگر معاشی اقدار پر عمل کیا جائے اور عوام کو مہنگائی کے عفریت سے نجات دلائی جائے۔ چین، روس، ایران، وسط ایشیائی ریاستوں، مسلم ممالک، لاطینی امریکہ، شمالی کوریا.... کی مدد سے آزاد سیاسی پالیسی اپنائی جائے۔ امریکی بلاک کے بغیر زندہ رہا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے فکری آزادی اور جرأت وحمیت کی ضرورت ہے، وہ کہاں سے لائی جائے؟ اور وہ بازار میں بکتی بھی نہیں کہ خرید لی جائے! موجودہ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ سے ہمارا مطالبہ اسی کا ہے لیکن زمینی حقائق کے پیش نظر اس کی توقع نہیں الاّ یہ کہ کوئی معجزہ ہوجائے! چلیے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے اور ملک وملت کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور ہمیں مشکلات سے نکالے۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔

تفہیم مغرب　　　انجینئر گلبدین حکمت یار

مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی
اور مسلم معاشرے پر اُس کے اثرات

ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ امت اسلامیہ کی موجودہ حالت اس شکست کا نتیجہ ہے جس میں اسلامی خلافت کی بیخ کنی کی گئی اور مغربی طاقتوں نے اسلامی دنیا کو آپس میں بانٹ لیا اور ہر حصے پر علیحدہ علیحدہ طاقت مسلط ہوگئی۔ اس کے بعد کتنے ماہ وسال بیت گئے کہ مسلمان ذلت، غلامی اور محکومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آزادی اور خود مختاری سے محروم ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور فکری لحاظ سے استعماری طاقتوں کے غلام ہیں اور انہوں نے اپنی کٹھ پتلی حکومتیں ان پر مسلط کی ہوئی ہیں۔ وہ ایسے جبر واستبداد کا سامنا کر رہے ہیں جس کی مثال دنیا کے کسی گوشے میں نہیں ملتی۔ ان کے حکمران غیر کے آگے ذلیل اور حقیر جبکہ قوم کے سامنے مغرور اور بے رحم ہیں۔ خود دوسروں کے غلام اور عوام کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ غلامی، ذلت اور محکومیت کی ایسی دردناک صورت حال میں مسلمانوں میں عزت نفس کا احساس، آزادی اور خود مختاری کا جذبہ، سربلندی، خودداری (ملی عصبیت)، زندگی کی تڑپ اور بے تابی دم توڑ چکی ہے۔

ایک وقت تو وہ تھا جب تمام اسلامی ممالک پر استعماری طاقتیں براہ راست اپنی فوجوں کے زور پر حکومت کرتی تھیں مگر جب یہ طاقتیں اپنے خاص عوامل کی وجہ سے نکل گئیں تو اپنے پیچھے ایسی رجیم (حکمران گروہ) چھوڑ گئیں جو ان کے مفادات کی محافظ ہیں۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی مسلح افواج کی ایسی تنظیم کی اور ایسے ڈھانچے تشکیل دیے کہ وہ کٹھ پتلی حکومتوں کی مدافعت اور قومی بیداری کو کچلنے کے لئے ان طاقتوں کی خدمت میں دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ ایسا تعلیمی نظام اور نصاب تشکیل دیا کہ تعلیمی اداروں کے زیر سایہ جوان ہونے والی نسل میں آزادی اور خود مختاری کا جذبہ پرورش نہ پا سکے بلکہ دوسروں کی غلامی اور تقلید پر احساس تفاخر میں مبتلا ہوں اور اپنے ملی اور اسلامی تشخص سے بیگانہ ہو جائیں۔ جاتے وقت ان ممالک کے جغرافیائی نقشے اس طرح ترتیب دیے کہ ایک طرف تو ان ممالک کے درمیان ہمیشہ سرحدی

تنازعات چلتے رہیں اور دوسری طرف ان ممالک میں آباد قومیں اور قبیلے جو ان استعماری قوتوں کے ساتھ لڑتی رہی تھیں اور ان کی ہیئت ترکیبی ایسی تھی کہ غلامی سے لگا نہیں کھاتی تھیں، وہ آپس میں مختلف ملکوں میں تقسیم ہو جائیں' اقتدار سے نکال دی جائیں اور اختیارات ان اقلیتوں کو منتقل ہو سکیں، جنہوں نے ان استعماری قوتوں کی پشت پناہی کی تھی اور مستقبل میں وہ ہمیشہ ان پر انحصار کرنے پر مجبور ہوں اور اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے ان کی تمام شرائط ماننے پر تیار رہیں۔

ان کی بہترین مثال پٹھان اور کُرد ہیں جنہیں ان استعماری قوتوں کے ساتھ مسلسل جنگ کے شعلے بھڑکائے رکھنے کے جرم میں علی الترتیب تین اور چار حصوں میں تقسیم کیا گیا استعماری قوتوں نے اس طویل عرصے میں وسیع پراپیگنڈے کے ذریعے قومی' لسانی اور علاقائی تعصّبات کو اتنی ہوا دے دی کہ کوئی بھی وسیع تر اور متحدہ ملت اور امت کا تصور منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ استعمار کی کھینچی گئی سرحدی لکیریں ناقابل تغیر اور مقدس قرار پا جائیں۔ اِس درے کے رہنے والے اُس درے کے رہنے والوں کو پرائے اور حتمی دشمن سمجھ بیٹھیں اور اصل دشمن کو بھول جائیں۔ ہمارے لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اسلامی ممالک کے اکثر حاکم اور نظامِ استعمار نے ہم پر مسلط کیے ہیں۔ یہ اسلامی ممالک میں استعمار کی باقیات ہیں یا خاندانی ہیں جو کسی خاص گھرانے نے عوام کی رائے کے خلاف زبردستی اور دوسروں کی مدد کے سہارے ہم پر ٹھونس رکھے ہیں یا فرقہ وارانہ اور قومی تعصب کی ہیئت ترکیبی پر استوار کئے گئے ہیں۔

کسی ایک مذہبی فرقے کے حامی تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں اور دوسروں کو ان کے اسلامی اور انسانی حقوق سے محروم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے سیاسی اور مذہبی پیشوا قتل کئے جا رہے ہیں۔ کوئی شیعہ کا سہارا لے کر سنیوں کو قتل کر رہا ہے اور کوئی سنی کا جامہ پہن کر شیعوں کا استحصال کر رہا ہے۔ اسلامی ممالک کے ان دردناک حالات پر وہی شخص راضی ہو سکتا ہے جو غلامی اور محکومیت میں پرورش پا کر جوان ہوا ہے، غلامانہ ذہنیت رکھتا ہے، آزادی کو نہ جانتا ہے نہ کبھی اس کا مزا چکھا ہے۔ یا وہ شخص جو اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے فساد، ظلم، بے انصافی اور بدامنی سے بے خبر ہے۔ جو یہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ ہر روز کتنے گھر اجڑ رہے ہیں؟ کتنے بے بس انسانوں کے جان و مال اور عزت پر دست درازی ہو

رہی ہے؟ سرمایہ دار کیسے سرمایہ دار بنے اور نادار کس طرح اور کس کے ظلم اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے اپنی ہر چیز سے محروم ہوئے؟ اسے معاشرے کی موجودہ حالت امن کی حالت نظر آ رہی ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ یہاں صرف حکمران امن سے رہتے ہیں، حکمرانوں کے علاوہ کسی کو امن کا احساس نہیں ہو رہا۔ یہاں پچانوے (95) فیصد لوگوں کے مال وعزت محفوظ نہیں ہے۔ اگر آپ یہاں کسی عام آدمی سے پوچھیں کہ وہ پولیس والے کے پاس سے گزرتے وقت کیا محسوس کرتا ہے؟ جب اس کے گاؤں میں پولیس آ جائے تو لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟ کیا ان کو دیکھ کر تحفظ کا احساس کرتے ہیں یا وردی میں ملبوس ڈاکو سمجھتے ہیں اور ان سے اس قدر خوفزدہ رہتے ہیں جتنے چوروں سے نہیں رہتے۔ حکام اور جج حضرات کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں؟ انہیں مظلوم کا حامی سمجھتے ہیں یا ظالم کا؟ دفتر میں افسر کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اس کی عدالت اور امانت پر کتنا اعتماد کرتے ہیں؟ نظام سے کیا فوائد اکٹھے کئے اور کیا بھلائی سمیٹی، یہ نظام کس سے ان کو بچا سکا ہے؟ کبھی اس کی عزت کا دفاع کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو کس کے مقابلے پر؟

آئیں دیکھیں! پولیس روزانہ کتنے لوگوں کو اور کتنا تنگ کرتی ہے؟ ہر روز، ہر گاؤں میں کوئی خان، ملک، مالدار، زمینوں کا مالک، نادار دیہاتیوں پر کتنے ظلم ڈھاتا ہے؟ کتنے لوگوں کی زمینیں، جائیدادیں طاقت ور کے ہاتھوں غصب ہوتی ہیں؟ بے کسوں کی کتنی بیٹیوں کے زبردستی نکاح پڑھائے جاتے ہیں اور کتنی دوشیزاؤں کی عزت لوٹی جاتی ہے؟ ہر روز، ہر دفتر میں کتنے ناجائز کام اور کتنی حق تلفیاں ہوتی ہیں؟ بیت المال میں کتنی خیانت کی جاتی ہے؟ حکمرانوں نے بیت المال سے جو نادار عوام سے ایک یا دوسرے بہانے ہتھایا گیا ہے، استفادہ کرنے، خوش حال زندگی گزارنے کے کیا کیا سامان کر رکھے ہیں؟ اور عام لوگ کس فقر، بھوک، خوف اور ذلت سے بھرپور دردناک زندگی گزار رہے ہیں؟ تعجب ہے اگر کوئی اسے امن کا نام دے کر کہتا ہے کہ ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے اس امن کو صدمہ پہنچے! کیا ہمیں اِس حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جبکہ ہمیں اطمینان ہے کہ ہم اس سے بہتر حالت لا سکتے ہیں۔ [۱]

---

[۱] اخذ واستفادہ سینیٹر (ر) طارق چوہدری، 92 نیوز، لاہور

تفہیم مغرب اوریا مقبول جان (۱)

مغرب کا معاشی نظام ایک سراب ہے

اور صرف مغرب کے سیاسی غلبے کی وجہ سے چل رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام ایک ٹھوس حقیقت ہے جس نے ایک ہزار سال تک مسلم حکومتوں کو کامیابی اور غلبہ عطا کیا

کیمونسٹ نظریے کے زوال سے پہلے پسماندہ ممالک کے جدید پڑھے لکھے افراد عموماً معیشت میں ہی ''دخل در معقولات'' کیا کرتے تھے۔ انہیں مارکسی فلسفہ اور معاشی نظام بہت پسند تھا اور وہ اس نظام کو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں انسانی دُکھوں کا مداوا سمجھتے تھے۔ پاکستان میں یہ ''سرخے'' کہلاتے لیکن یہاں ان کا ہدف مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام نہیں بلکہ اسلام اور اس کا معاشی نظام ہوتا۔ وہ اس دور میں ایک ہی سوال کیا کرتے، ''کیا اسلام کا کوئی معاشی نظام ہے؟'' اگر ہے تو جدید دور کے مسائل کا اس کے پاس کوئی حل بھی موجود ہے اور اس معاشی نظام کے ماہرین کون ہیں/ کہاں ہیں؟

مارکسزم دفن ہو گیا، لینن گراڈ واپس سینٹ پیٹرز برگ کہلانے لگا اور اس کے ماننے والے جو کبھی امریکہ کو لعنت ملامت کیا کرتے تھے اب اسی سرمایہ دارانہ نظام کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی کایا کلپ کے باوجود ان کی اسلام سے دُشمنی بدلی اور نہ ہی ان کا یہ سوال کہ ''کیا اسلام کا کوئی معاشی نظام ہے اور اگر ہے تو اس معاشی نظام کے ماہرین کہاں ہیں؟ یوں تو اس سوال کا جواب ہر دور میں دیا جاتا رہا ہے لیکن گزشتہ چند سال خصوصاً 2008ء کے معاشی بحران کے بعد تو دنیا بھر کے معاشی مفکرین، اسلامی معاشی نظام کی جانب سوچنے پر ایسے مجبور ہوئے کہ انہوں نے اسلامی معاشی نظام سے متعلق ذہنوں پر چھائی صدیوں کی جہالت کا پردہ پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ پھر بھی میرے ایک دوست کالم نگار کے کالم نگار بیٹے نے اپنے کالم میں طنزاً یہ فقرہ تحریر کیا ہے کہ ''سٹیٹ بینک کی مانیٹری پالیسی کیا ہو گی؟ یہ اسلام کا نہیں معیشت کا سوال ہے، اس کا جواب مولانا مودودیؒ نہیں جان مینارڈ کینز نے دینا ہے''۔

میرے دوست کو یقیناً اندازہ ہو گا کہ جان مینارڈ کینز کو مرے ہوئے چھہتر (76) سال

---

(۱) '92' نیوز لاہور۔ عنوان البتہ ہمارا تجویز کردہ ہے۔

بیت گئے اور آج کی جدید مانیٹری پالیسی جس کا وہ تذکرہ فرمارہے ہیں اس کی تشکیل کا کینز کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج کی معاشی دنیا امریکی شہر بریٹن ووڈز (Bretton Woods) میں 44 ملکوں کے 730 ماہرین کے قائم کردہ عالمی مالیاتی یا ''مانیٹری'' نظام کی پیداوار ہے، جس کا تعلق معاشیات کے نفسِ مضمون سے نہیں بلکہ دنیا کو معاشی طور پر غلام بنانے کے لیے ایک سسٹم کو زبردستی لاگو کرنے سے ہے۔ یہ عالمی طاقتیں کبھی بھی ایسا عالمی مالیاتی نظام قائم کرنے کے قابل نہ ہوتیں اگر انہیں دوسری جنگِ عظیم میں فتح نصیب نہ ہوتی۔ جیسے ہی نارمنڈی فتح ہوا تو اس کے فوراً بعد بریٹن ووڈز کانفرنس طلب کی گئی، جس کی کوکھ سے عالمی مالیاتی نظام اور اس کے نفاذ کے دو اہم ادارے انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ اور ورلڈ بینک وجود میں آئے۔ ان دونوں اداروں کا مقصد دراصل دنیا کی تمام معیشتوں کو کنٹرول کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آئی ایم ایف کے پہلے دو مقاصد رکھے گئے۔ ایک: عالمی مالیاتی اشتراک کے لیے کام کرنا اور دوسرے دنیا میں معاشی استحکام قائم کرنا۔ اسی مالیاتی نظام کے تحت ہی سب سے پہلے دنیا کے تمام ممالک کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک مصنوعی اور جعلی کاغذی کرنسی کا نظام اختیار کریں جس کے لیے ہر ملک کا ایک سنٹرل بینک ہونا چاہئے جو اس جعلی کاغذی کرنسی کو چھاپنے کا اہتمام کرے۔ اس ''جبری نفاذ'' سے پہلے دنیا بھر کی معیشتیں ہمیشہ اس چیز کو کرنسی مانتی تھیں جس کے اندر اس کی از خود قیمت موجود ہو (intrinsic value of its own)۔ یعنی اگر اسے بازار میں جا کر بیچا جائے تو کسی بھی قسم کی گارنٹی کے بغیر اس کی قیمت مل جائے جیسے سونا اور چاندی وغیرہ۔ لیکن اگر کاغذ کے نوٹوں کو بغیر کسی گارنٹی کے بیچا جائے تو ردّی کے بھاؤ بھی نہیں بکیں گے۔ یوں کاغذی کرنسی کے نفاذ سے اس عالمی دھوکہ دہی، فراڈ اور جعلی مالیاتی نظام کا آغاز ہوا۔

اس سے پہلے اگر کوئی کاغذی کرنسی نما چیز موجود تھی بھی تو اس کی حیثیت صرف ایک ''معاہداتی دستاویز'' (Promissory note) سے زیادہ نہ تھی۔ آغاز میں یہ کلیہ بنایا گیا کہ ان کاغذ کے جعلی نوٹوں کے بدلے تمام ملک اپنے پاس سونے کا ذخیرہ رکھیں جسے "Gold Standard" کہا گیا۔ لیکن صرف 18 سال کے بعد 1973ء میں جب فرانس کے صدر نے امریکی صدر سے یہ مطالبہ کیا کہ فرانس کے دو ارب ڈالر امریکی بینکوں میں موجود ہیں، ان کے بدلے اسے سونا چاہئے تو ساری عالمی ''مانیٹری پالیسی'' کا فراڈ سامنے آ گیا کیونکہ امریکہ کے

پاس تو اتنا سونا موجود ہی نہیں تھا جتنے اس نے ڈالر چھاپ رکھے تھے۔اس نے صاف انکار کر دیا اور دنیا کو ایک اور جعلی تصور دیا گیا جس کا نام "Goodwill of a Country" یعنی کسی ملک کی ''معاشی حیثیت'' رکھا گیا۔اب اس حیثیت کا اندازہ کون لگائے۔اس کے لئے ایک عالمی بینک پہلے سے موجود تھا جس کا نام تھا "International of Bank Settlements" اس بینک کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ ہر ملک کی کرنسی کی حیثیت (Value) کا تعین کرے۔اس بینک کی کارگزاری ملاحظہ ہو۔نائیجیریا ایک ایسا ملک ہے، جس کے پاس سعودی عرب سے بھی زیادہ تیل ہے،لیکن اس کی کرنسی کمزور ہے،جبکہ آئس لینڈ جہاں گھاس بھی نہیں اُگتی اس کی کرنسی مضبوط ہے۔دنیا کا سب سے زیادہ سونا افریقہ میں پیدا ہوتا ہے لیکن عالمی ''گولڈ سٹینڈرڈ'' امریکہ اور یورپ کے پاس ہے۔یہ ہے طاقت کے بل بوتے پر معیشتوں پر قبضہ۔اسی سال 1973ء میں اس جعلی کاغذی کرنسی کو سونے کے بجائے پٹرول سے ''قیمت'' (Value) دینے کی کوشش کی گئی۔تیل پیدا کرنے والے ملکوں سے کہا گیا کہ وہ اپنا تیل صرف ڈالروں میں بیچیں گے۔یعنی اگر پاکستان، ملائیشیا، فرانس یا دیگر ممالک نے تیل خریدنا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنی مصنوعات وغیرہ بیچ کر امریکی ڈالر خریدیں گے اور پھر ان ڈالروں سے تیل خریدیں گے جو اصل میں عربوں اور افریقیوں کی ملکیت ہے۔یوں تیل صرف ڈالروں میں خریدا جانے لگا اس لئے ڈالر ہی سٹینڈرڈ بن گیا اور اس کے مقابلے باقی تمام کرنسیاں ذلیل ورُسوا۔یہی ڈالر ہے جو محض بہترین پرنٹنگ والے ایک کاغذ کے سوا کچھ نہیں۔آج اگر یہ اعلان ہو جائے کہ تیل صرف پاکستانی روپوں میں خریدا جائے گا،تو دنیا میں ایک روپے کے سو ڈالر مارکیٹ میں ملنے لگیں۔

اس ساری مانیٹری پالیسی کا نہ معیشت سے کوئی تعلق ہے اور نہ مولانا مودودیؒ اور کینز سے۔اس عالمی مانیٹری پالیسی سے نہ کسی ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی معیشت کی درستگی کی جاتی ہے۔یہ تو ایک طاقتور قوت کا زبردستی نافذ کیا گیا فراڈ ہے۔مگر اس فراڈ کو علمی سطح پر جائز قرار دینے کے لئے دنیا کی یونیورسٹیوں میں ایک معاشی علم تخلیق کیا گیا ہے جسے جدید معاشی و مالیاتی سائنس کہتے ہیں۔اگر دنیا سے کاغذی جعلی کرنسی کا وجود ختم ہو جائے تو اس معاشی سائنس کے لاتعداد مضامین ناکارہ ہو جائیں۔مثلاً پاکستان کے سونے کے سکے اور

فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے سونے کے سکے میں رتی برابر بھی فرق نہیں ہوگا۔ یہ سب ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر کام کریں گے اور یوں جدید معاشیات کا وہ علم جو شرح تبادلہ (Exchange Rate) سے تعلق رکھتا ہے بالکل بے کار ہو جائے گا۔ اسی طرح کاغذی نوٹ چھاپ کر جو افراطِ زر پیدا کی جاتی ہے اس کا مضمون بھی نصاب سے خارج کرنا پڑے گا۔ اس عالمی مالیاتی سودی نظام کا کوئی تعلق معاشی سائنس سے ہے اور نہ معاشی تجزیئے سے، بلکہ عالمی طاقتوں کی قوتِ نافذہ سے ہے۔ اگر اس کا کوئی تعلق معاشی ترقی سے ہوتا تو جاپان مدتوں عالمی معیشت پر چھایا رہا، لیکن اس بیچارے کو تو سکیورٹی کونسل میں مستقل نشست بھی نہیں دی گئی۔

گزشتہ تین چار صدیوں سے ایک معاشرتی و سیاسی علمی ذخیرہ (Body of Knowledge) تخلیق کیا گیا ہے جس کا اہم حصہ معاشی نظام بھی ہے۔ اس علمی ذخیرے میں دنیا کی معیشت کی عمومی سادگی کو ایک گورکھ دھندے کی صورت میں ایک معاشی سائنس نامی علم کے طور پر ایجاد کیا گیا۔ ان جدید علوم کی تمام تر بنیاد سیکولر خیالات پر رکھی گئی اور مذہب کے عطا کئے گئے علم کو ایک جبری قول (Dogma) کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ مذہب انسان کی سوچ کو محدود کرتا ہے اور اسے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ دنیا بھر کے تعلیمی اداروں میں اسی طرح کے علم کو پڑھایا جانے لگا اور ایسے ہی علم کے اربابِ تخلیق کو حرفِ آخر بلکہ ''حرفِ کل'' سمجھا جانے لگا۔ پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، اکنامکس اور پھر ان کے ذیلی مضامین۔ ان تمام مضامین کو سیکولر رنگ دینے اور اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرنے کے لیے ایک متعصب اور جھوٹی تاریخ بھی مرتب کی گئی۔ اس بددیانت تاریخ کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا کی تاریخ میں ترقی کا سرچشمہ دراصل یونان تھا جس کے تمام فلسفی جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ساڑھے تین سو سال پہلے تک دنیا پر چھائے ہوئے تھے، انہوں نے سب سے پہلے فلسفہ، اُصولِ حکمرانی، طرزِ معیشت، طب اور دیگر تمام علوم میں دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ لیکن ان کے جانے کے بعد ایک تہذیبی زوال کا دور شروع ہو گیا اور دنیا معاشی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ایک طویل تاریکی میں ڈوب گئی۔ اس عرصے کو وہ ''تاریک ادوار'' (Dark Ages) کہتے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی یا بعض کے نزدیک گیارہویں صدی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اصطلاح روم کے مشہور دانشور فرانسسکو پٹرارکا (Francesco

Petrarca) نے تخلیق کی جسے عرفِ عام میں پیٹراک (Petrach) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ شخص یورپ میں تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) کے دور کا شاعر اور فلسفی تھا جو 1374ء میں فوت ہوا۔

اس کے بعد ہر آنے والے مؤرخ نے اسی کے دیئے ہوئے اس تصور کی جگالی کی۔ یہاں تک کہ تازہ ترین فلاسفر اور مؤرخ ول ڈیورانٹ (Will Durant) نے اپنی گیارہ جلدوں پر مشتمل کتاب ''تہذیب کی کہانی''(The Story of Civilization) تحریر کی تو اس نے بھی ان سات صدیوں کا ذکر ایک چھوٹی سی جلد میں کیا اور اس کا بھی نام بھی مسلمانوں یا اسلام کے حوالے سے نہیں رکھا بلکہ اپنے تعصب کا اظہار کرتے ہوئے اسے ''ہمارا شاندار مشرق''(Our glorious East) کا نام دیا۔ ول ڈیورانٹ کی یہ تاریخ 1935ء میں چھپنا شروع ہوئی اور 1975ء میں اس کی آخری جلد چھپی، یعنی انتہائی جدید تاریخ ہے۔ امریکہ اور یورپ کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والا طالب علم اسی ''متعصب'' علم کی بنیاد پر یہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا تاریخی طور پر علم وآگہی کے اعتبار سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد پانچ سو سال تو مہذب اور روشن رہی لیکن پھر اس کے بعد کم از کم سات سو سال اور زیادہ سے زیادہ دس سو سال تک تاریکی میں ڈوبی رہی۔ اس کے بعد یورپ نے اسے آکر تاریکی سے نکالا اور تہذیب کی روشنی دکھائی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دورِ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش (571ء) سے لے کر مسلمانوں کے تہذیبی عروج کا زمانہ تھا، اور مغربی مصنّفین نے اس کا ذکر تاریک دور سے ہی کرنا تھا۔

تاریخی بددیانتی کا یہی اثر معیشت کے ماہرین پر بھی ہوا اور انہوں نے بھی ایسی لاتعداد کتابیں تحریر کیں جس میں لکھا گیا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے بعد کی پانچ صدیوں تک دنیا میں معاشی علم اور تجزیہ موجود تھا۔ لیکن اس کے بعد کی سات صدیاں یوں لگتا ہے جیسے کسی واضح معاشی نظام کے تابع نہیں تھیں، اسی لئے کوئی معاشی ماہر یا تجزیہ کرنے والا نظر نہیں آتا۔ معیشت دان اس عرصے کو بہت بڑا خلا (Great Gap) قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عرصے میں کبھی بھی معیشت یا معاشی نظام کو ایک علم کے طور پر دیکھا گیا اور نہ ہی پڑھا یا پڑھایا گیا۔ یعنی معاشی تجزیہ (Economic Analysis) نام کی چڑیا ان سات سو سال

کے عرصے میں موجود ہی نہیں تھی۔ اس ''متعصب تصور'' کو جدید دور کے ایک بہت بڑے سیاسی معیشت دان (Political Economist) جوزف ایلوز شوم پیٹر (Joseph Alois Schumpeter) نے کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ''معاشی تجزیے کی تاریخ'' (History of Economic Analysis) میں اپنے مخصوص دلائل کے ساتھ اکٹھا کیا ہے۔ یہ شخص مشہور معیشت دان ''کینز'' کا ہم عصر تھا۔ یہ 1919ء میں تھوڑے عرصے کے لئے جرمن آسٹریا حکومت میں وزیر خزانہ رہا اور پھر اپنی مخصوص مذہبی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے 1932ء میں امریکہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوا اور وہاں ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر لگ گیا۔ اس نے معاشی تجزیہ کاری کی ایک طویل تاریخ مرتب کی مگر اس نے ویسی ہی بددیانتی کی جو دیگر موضوعات پر تاریخ لکھنے والے مغربی تاریخ دانوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی۔ اس نے لکھا ہے کہ معیشت، اس کے نظام ہائے کار اور ان کے تجزیہ کا آغاز یونانی فلسفیوں کے دور میں شروع ہوا اور پھر ان کے بعد دوبارہ کوئی عالم، مفکر یا معاشی ماہر ایسا پیدا نہ ہوا جو اس معاشی تجزیے کی سائنس کا احیاء کر سکے۔ یہاں تک کہ یورپ سے ہی اس علم کا دوبارہ آغاز سینٹ تھامس ایکوانس (St. Thomas Aquinas) نے کیا۔ یہ شخص یورپ کی تحریکِ احیائے علوم کے ابتدائی ایّام میں پیدا ہونے والا ایک پادری تھا جو فلسفہ اور سیاسیات وغیرہ پر کتابیں تحریر کرتا تھا۔ اس کی شہرت اس کی تھیوری ''فطری مذہبیت'' (Natural Theology) کی وجہ سے ہے، جس کے تحت اس نے پہلی دفعہ عیسائیت کے بارے میں یہ تصور دیا کہ خدا دراصل عقیدے کی بات نہیں ہے بلکہ عقل کی بھی تخلیق ہونا چاہئے۔

یہیں سے یورپ میں عقلیت پرستی کا آغاز ہوا اور الحاد تک بات جا پہنچی۔ اس شخص کی تحریروں میں کہیں کہیں معیشت پر بھی گفتگو مل جاتی ہے جس کی بنیاد پر اسے یونان کے فلسفیوں کے پندرہ سو سال بعد پیدا ہونے والا پہلا معاشی تجزیہ نگار قرار دیا گیا اور درمیان کے عرصے کو معاشی علم کے اعتبار سے ''تاریک دور'' قرار دے دیا گیا حالانکہ اس سارے عرصے میں اسلامی معیشت، اسلامی معاشی نظام اور اسلامی مانیٹری پالیسی کے حوالے سے مسلمان فقہا، مفکرین اور دانشوروں نے بہترین کام کیا، جبکہ یورپ میں اس وقت اس علم سے آگاہی تک نہ تھی۔ (بقیہ صفحہ نمبر:۴۹)

تفہیم مغرب ڈاکٹر محمد باقر خاکوانی

یورپ اور مغرب میں انسانی کتے

ٹرانس جینڈر جیسا قبیح اور ننگِ انسانیت فعل یعنی انسانوں کا اپنی جنس کو مذکر سے مونث یا اس کے برعکس تبدیلی کا عمل سیکولر یورپ اور مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرہ میں تو بہت پرانا ہو گیا ہے۔

اب دین سے کوسوں دور لادینیت کے حامل یورپ میں لوگ خود کو کتا ڈیکلیئر کر کے کتے جیسی زندگی گزارتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ انہیں "Human puppies" کہا جاتا ہے۔ ایسے انسانی کتے نما جانوروں کی تعداد صرف برطانیہ میں 10,000 سے متجاوز ہے۔ ان انسانی کتوں میں بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر ہیں۔

یہ آزادی جو باطن میں گندی اور انسان وانسانیت دشمن نفسانی خواہشات میں گرفتاری ہے، سیکولر یورپی تہذیب کا بنی نوع انسان کے لئے ایسا جدید تحفہ ہے جس میں انسان کو اسلام کی طرف سے اشرف المخلوقات اور مخدوم کائنات کے مقام سے گرا کر کتے، بلے، چوہے اور ذلیل ترین مقام تک پہنچا دیا گیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اب یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ انسان کی عظمت، رفعت اور اسے کائنات کی عظیم مخلوق حتیٰ کہ اسے مسجود ملائک کا مقام دینے والا اسلام اور صرف اسلام ہے۔ علامہ اقبال نے صحیح پیشین گوئی کی تھی کہ ۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

افغانستان

رشید صافی

افغانستان۔ملا عمرؒ کی پالیسیوں پر اصرار

افغانستان کی داخلی سیاست کا ایک معروضی جائزہ

اگست 2021ء کو افراتفری میں امریکی انخلا مکمل ہوا تو طالبان کو کابل پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دنیا کو توقع تھی کہ طالبان کی موجودہ قیادت سابقہ قیادت سے مختلف ہوگی۔ قیاس آرائیاں کی جانے لگیں کہ حالات نے طالبان کے رویوں کو تبدیل کر دیا ہوگا اور اب کی بار دنیا کو نئے طالبان دیکھنے کو ملیں گے۔ان قیاس آرائیوں کی بنیادی وجہ دوحہ معاہدے میں طالبان کا مثبت طرزِ عمل تھا۔ جب کابل پر طالبان کا قبضہ ہو گیا تب بھی انہوں نے دنیا کے ساتھ چلنے کے عزم کا اظہار کیا تھا اور برملا کہا کہ وہ افغان سرزمین کو دہشت گردی کے لیے استعمال نہیں ہونے دیں گے لیکن طالبان کی گزشتہ ڈیڑھ سالہ حکومت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مُلا عمرؒ کی پالیسیوں پر مضبوطی سے کاربند ہیں۔اس کا ایک مظہر اس وقت دیکھنے کو ملا جب انہیں کابل کا کنٹرول سنبھالے محض چند روز ہوئے تھے۔طالبان شوریٰ کے تین روزہ اجلاس کے اختتام پر طالبان قیادت نے گروہوں کی شکل میں مُلا عمرؒ کی قبر پر حاضری دی۔اس حاضری میں بظاہر مُلا عمرؒ کے لیے فاتحہ خوانی اور دعا کی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ طالبان شوریٰ نے حکومت سازی کے لیے سب سے پہلا جو کام کیا وہ مُلا عمرؒ کی قبر پر حاضری تھا۔کئی طالبان رہنماؤں کو مُلا عمرؒ کی قبر پر حاضری کے وقت دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔طالبان کی مُلا عمرؒ سے عقیدت کا دوسرا مظہر اس وقت دیکھنے کو ملا جب اکیس برس بعد مُلا عمرؒ کے استعمال میں رہنے والی گاڑی کو زیرِ زمین سے نکال کر نیشنل میوزیم میں رکھا گیا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو طالبان مُلا عمرؒ سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں وہ ان کے نظریے کو کتنی اہمیت دیتے ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ طالبان کی موجودہ قیادت مُلا عمرؒ کے طرزِ حکومت کے علاوہ کوئی دوسرا طرزِ حکومت اپنانے کے لیے تیار نہیں۔

افغانستان میں کئی گروپ موجود ہیں جن کی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ طالبان کا

قندھاری گروپ جس کے سر براہ اس وقت بظاہر مُلا حسن اخوند ہیں جو افغانستان کے عبوری وزیر اعظم بھی ہیں، مگر اصل میں امیر المومنین کہلوانے والے مُلا ہبت اللہ ہی افغانستان کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ افغانستان حکومت مُلا ہبت اللہ کی پالیسی پر عمل پیرا ہے جو دراصل مُلا عمرؒ کی پالیسیوں کو لے کر چل رہے ہیں، کیونکہ مُلا ہبت اللہ مُلا عمر کے قریبی ساتھی رہے ہیں اور طالبان کے سابق چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ سیاسی، مذہبی اور عسکری امور میں ان کی بات کو حتمی تصور کیا جاتا ہے اور وہ مُلا عمرؒ کے نظریے پر سختی سے کاربند ہیں۔ مُلا ہبت اللہ مُلا عمرؒ کے طرزِ حکومت کے داعی ہیں اور وہ اسی نظام کو افغان عوام کے لیے آئیڈیل نظام سمجھتے ہیں۔ مُلا ہبت اللہ کو مُلا حسن اخوند، مُلا عبدالغنی برادر، ملا عبدالسلام حنفی اور مُلا یعقوب کی معاونت حاصل ہے۔ قندھاری گروپ دوسرے گروپوں کی نسبت سخت گیر ہے اور اسی گروپ کے پاس حکومت کا بیشتر حصہ ہے۔

حقانی گروپ بھی حکومت کا حصہ ہے جس کے سر براہ جلال الدین حقانیؒ تھے۔ نائن الیون کے بعد حقانی خاندان نے بڑی قربانیاں دیں۔ ان کے کئی افراد ڈرون حملوں میں مارے گئے، اسی لیے طالبان حلقوں میں حقانی خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگست 2021ء میں طالبان کی دوبارہ حکومت قائم ہوئی تو جلال الدین حقانیؒ کے بیٹے سراج الدین حقانی کو وزیر داخلہ بنایا گیا اور ان کے چچا خلیل حقانی کو مہاجرین کا وزیر بنایا گیا۔ جلال الدین حقانیؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے انس حقانی چونکہ کم عمری میں امریکی قید میں رہ چکے ہیں اور انہوں نے پانچ برس سے زیادہ قید کاٹی ہے اس لئے انہیں بھی طالبان حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ انس حقانی کابینہ میں شامل تو نہیں البتہ انہیں طالبان کے سیاسی دفتر کا رکن بنایا گیا ہے۔ حقانی قیادت قندھاری گروپ کی نسبت کم سخت گیر ہے۔ یہ دنیا کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں، بات چیت کے لیے ہر وقت تیار ہیں اور زمانے کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حقانی پاکستان کے بڑے قریبی ہیں حتیٰ کہ امریکہ سے بھی ان کے روابط ہیں۔ دوحہ میں امریکہ کے ساتھ مذاکرات میں اس گروپ کا اہم کردار تھا۔ ایران اور سعودی عرب کے ساتھ بھی ان کے تعلقات ہیں۔ ان میں نسبتاً ماڈرن سوچ پائی جاتی ہے۔ افغانستان کرکٹ بورڈ جیسے اداروں کی سرپرستی بھی حقانی گروپ کر رہا ہے۔ وہاں کھیل کی جو محدود سرگرمیاں رہ گئی

ہیں وہ بھی حقانیوں کے علاقوں میں ہوتی ہیں۔مگر قندھاری گروپ کی نسبت ان کی تعداد کم ہے۔افغانستان کے صوبے پکتیکا، پکتیا،طورخم اور پاکستان کی مغربی سرحدات سے ملحق پختون علاقوں میں ان کا اثر ورسوخ زیادہ ہے۔افغانستان کے جنوبی علاقے جو رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بڑے ہیں وہاں پر قندھاری گروپ کی اکثریت ہے اس لئے افغانستان کی مجموعی پالیسی سازی میں حقانی گروپ کا کردار کم دکھائی دیتا ہے کیونکہ افغانستان کے تقریباً 70 فیصد علاقے پر سخت گیر مؤقف رکھنے والے گروپ کا غلبہ ہے۔حکومت کا حصہ ہونے کے باوجود ان دونوں گروپوں میں کسی قدر کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔حقانی گروپ کا جن علاقوں میں اثر ورسوخ ہے وہاں ان کے ایجنڈے کی راہ میں قندھاری گروپ رکاوٹ ہے یا داعش کا چیلنج موجود ہے۔حقانی گروپ پر پاکستان نواز ہونے کا الزام بھی ہے۔دنیا طالبان حکومت سے جو چاہتی ہے گروپوں کی اپنی اپنی سوچ اور نظریہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اس تناظر میں اگر دیکھیں تو حقانی اگر چاہیں بھی تو دنیا کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکتے۔

داعش کی موجودگی صرف حقانی گروپ کے لیے ہی چیلنج نہیں بلکہ افغانستان میں بدامنی کے پیچھے داعش کا عمل دخل ہے جو طالبان حکومت کے ایجنڈے کی راہ میں بھی رکاوٹ بن چکی ہے۔ترکمانستان تحریک افغانستان کے کئی علاقوں میں اپنا وجود رکھتی ہے۔اسی طرح چیچن مجاہدین نے اپنی الگ تحریک بنا رکھی ہے۔افغانستان میں موجود ہر عسکری گروپ کی الگ آئیڈیالوجی ہے اور یہ گروپ دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتے۔سوویت یونین کے بعد جیسے حالات افغانستان میں پیدا ہوئے اور گروپوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی،جس میں خونریزی کی داستانیں رقم کی گئیں، اب ویسی صورت حال تو نہیں ہے مگر جب تک افغانستان میں عسکری گروپ موجود ہیں افغانستان میں امن کا قیام اور استحکام پیدا ہونا مشکل ہدف ہوگا۔افغانستان سے پہلے دیگر ممالک کو شکایات تھیں، اب چین کو بھی تحفظات ہیں اور تشویش لاحق ہوچکی ہے۔ایک عسکری گروپ The East Turkestan Islamic Movement(ETIM) ہے جس میں ایغور اور سنکیانگ سے ہجرت کرنے والے لوگ ہیں جو چین کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ چین بھی اس گروہ پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے۔(بقیہ صفحہ نمبر:۲۸)

افغانستان ڈاکٹر محمد امین

پاک افغان تعلقات میں امریکی کردار

کیا امریکہ ایک بار پھر پاکستان کو افغانستان کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟

ہماری خواہش اور پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کے دینی حلقوں کی رائے اور خواہش کے برعکس زمینی حالات یہی بتاتے ہیں کہ امریکہ ایک بار پھر پاکستان کو افغانستان کے خلاف متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ بدقسمتی ہوگی اور اس کے نہایت بُرے اثرات اور نتائج پاکستان، افغانستان اور عالم اسلام کو بھگتنا ہوں گے اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اس پر خوشیاں منائیں گے۔

ہماری اس رائے کا سبب کیا ہے؟

مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے علم بردار امریکہ و یورپ کی اسلام اور مسلم دشمنی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جو بصارت و بصیرت سے محروم ہو۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمان ممالک کو ٹکڑوں میں بانٹنا، انہیں غلام بنانا، لُوٹنا اور کچلنا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہونے والے مسلم ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں بنوانا، انہیں قرضوں میں جکڑنا، تعلیم اور میڈیا کے ذریعے ان کی ذہن سازی کرنا اور ساری کوششوں کے باوجود جب کچھ مسلم ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں اپنی قوت قاہرہ سے کچل دینا۔ عراق، افغانستان اور لیبیا کی تباہی، شام اور یمن کی بربادی اور پاکستان، ایران، سعودی عرب اور ترکیہ پر شدید دباؤ محض اتفاقات یا حادثات نہیں بلکہ مغرب کی پلاننگ اور حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔

امریکہ و یورپ کا عالم اسلام کو دبا کر رکھنے اور انہیں زوال سے نکلنے نہ دینے کا یہ خواب اگرچہ افغان مجاہدین نے اس وقت تار تار کر دیا جب انہوں نے بیس سال تک قربانیاں دے کر امریکہ اور یوپ کے ۴۸ ممالک کے متحدہ لشکرِ کفار کو شکست دی۔ امریکہ تب سے زہریلے ناگ کی طرح زہر گھول رہا ہے اور اس کی بھرپور کوشش اور پلاننگ ہے کہ افغانستان میں

طالبان انقلاب کو ناکام کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے افغانوں کے ۷ ارب ڈالر کے ریزروفنڈز ضبط کر لیے، اس نے افغانستان کو جائز قانونی حکومت تسلیم نہ کیا اور نہ کسی کو کرنے دے رہا ہے۔ اس نے اپنی قائم کردہ دہشت گرد مسلم تنظیم ''داعش'' کو افغانستان میں متحرک کر دیا ہے جس نے وہاں امن وامان کو خطرے سے دو چار کر رکھا ہے اور وہاں آئے روز خود کش دھماکے ہوتے ہیں۔ وہ افغان ریزو فنڈ سے طالبان کے مخالف دھڑوں کو اکٹھا کر کے افغانستان میں سیاسی اور معاشی عدم استحکام پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پاکستان میں تحریک انصاف کی حکومت افغانیوں کے لیے نرم گرشہ رکھتی تھی۔ اس نے نوزائیدہ افغان حکومت کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ دنیا بھر کے ممالک کو اس نے متوجہ کیا کہ وہ افغانیوں کی مدد کریں تاکہ وہاں بھوک اور انسانی المیے سے بچا جاسکے۔ امریکہ نے افغانستان کو کمزور کرنے اور اس کے خلاف سازشوں اور ممکنہ عسکری کاروائیوں کے لیے پاکستان کی مدد لینا چاہی تو عمران خان نے انکار کر دیا اور اپنا جھکاؤ چین اور روس کی طرف کر دیا۔ امریکہ نے اس پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے مل کر تحریک انصاف کی حکومت ختم کرادی اور بدعنوان سیاسی عناصر پر مشتمل ایک ایسی حکومت قائم کرادی جو امریکہ کے کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرسکتی۔ وہ یوکرین کی جنگ میں بھی امریکہ ویورپ کی مدد کر رہی ہے اور افغانستان کے خلاف امریکی کاروائیوں میں مدد دینے کے لیے بھی تیار ہے۔

اب فضا یہ بنائی جارہی ہے کہ 'تحریک طالبان پاکستان' (ٹی ٹی پی) جو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی حملوں، امریکی دباؤ پر وہاں پاکستانی فوج کے آپریشنز اور اس کی افغانستان میں امریکی مداخلت کی حمایت کے ردّعمل میں قائم ہوئی تھی لیکن پھر امریکہ نے سازش اور دو رخی سے کام لیتے ہوئے ٹی ٹی پی میں اثر ورسوخ پیدا کرلیا اور بھارت کو ساتھ ملا کر اسے پاکستان میں دہشت گردی کی کاروائیوں اور فوج کے خلاف اسے لڑنے میں مدد دی۔ اب امریکہ نے اس ٹی ٹی پی اور داعش کو پاکستان کے شمالی علاقوں میں پھر متحرک کر دیا ہے اور انہوں نے وہاں دہشت گردانہ کاروائیاں شروع کر دی ہیں۔ یہ پاکستانی حکومت اور فوج پر دباؤ کی ایک صورت ہے۔

دوسری طرف تحریک انصاف نے عمران خان کی سربراہی میں اس صورتِ حال کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس بارے میں عوام کی حمایت حاصل کرلی۔ پاکستانی معیشت جو پہلے ہی کئی برسوں سے نالائق اور بدعنوان حکومتوں کی وجہ سے روبہ زوال تھی، اس سیاسی عدم استحکام کے بوجھ تلے پِس کررہ گئی اور پاکستان ڈیفالٹ ہونے کے دہانے پر ہے۔ اس حالت میں کہ پاکستانی حکومت ایک ایک ڈالر کی محتاج ہے، امریکہ نے اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا ہے اور افغان بارڈر پر اسے مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پاکستانی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ اس پیشکش کو ردّ کرنے کی پوزیشن میں نہیں چنانچہ بظاہر یہ لگتا ہے کہ مچھلی یہ کانٹا نگل لے گی۔

دوسری طرف افغانستان میں اِس وقت طالبان کی بھی وہ پوزیشن نہیں جو ملا عمرؒ کے زمانے میں تھی۔ اُس وقت پاکستان نے روس کے خلاف لڑنے میں افغان مجاہدین کی مدد کی تھی اور طالبان کا بھی ساتھ دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس وقت کی طالبان حکومت پاکستان کی حامی تھی اور پاکستان اپنے مغربی بارڈر کی طرف سے مطمئن تھا۔ لیکن جب امریکہ نے افغانستان میں مداخلت کی تو پاکستان کی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ نے افغان بھائیوں کا ساتھ دینے کی بجائے امریکیوں کا ساتھ دیا اور امریکہ و یورپ کی متحدہ فوج پاکستانی سرزمین استعمال کرکے افغانوں کو ذبح کرتی رہی۔ لہٰذا اب جب افغانستان نے امریکہ و یورپ کو فوجی شکست دے دی تو ظاہر ہے طالبان کے دل پاکستان کے حوالے سے کھٹے ہیں اور پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے وہاں گرم جوشی نہیں پائی جاتی۔ اب اگر پاکستان دوبارہ امریکیوں کو افغانیوں کے خلاف لڑنے میں مدد دیتا ہے تو افغان طالبان حکومت کیوں کر اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرے گی؟ ممکن ہے وہ ٹی ٹی پی کی سرگرمیوں سے صَرفِ نظر کرے۔ پچھلے دنوں جب بارڈر پر جھڑپیں ہوئی تھیں تو پاکستانی میڈیا اور عوام کو یہی بتایا گیا کہ حملہ افغان بارڈر فوج نے کیا تھا لیکن بین الاقوامی ذرائع ابلاغ طالبان حکومت کے احتجاج کی خبر دے رہے تھے کہ حملے کی شروعات پاکستان کی طرف سے ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے ہمارے لیے اس ضمن میں بلاتحقیق کچھ کہنا مناسب نہیں لیکن حالات کا رُخ بتارہا ہے کہ امریکی اثرات اور شرارتوں کی وجہ سے پاکستان کا مغربی بارڈر پرسکون نہیں رہ سکے گا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۱)

افغانستان　　ڈاکٹر محمد امین

افغانستان میں خواتین کی تعلیم وملازمت کا مسئلہ
مغربی ممالک اور سیکورٹی کونسل کے مطالبات

مغرب کی نظر میں یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ وہاں کی حکومتوں کے علاوہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ اقوام متحدہ تو مغرب کی لونڈی ہے اور وہ جو اس سے چاہتے ہیں منوا لیتے ہیں اور اس لیے بھی کہ سیکورٹی کونسل میں دو ارب مسلمانوں کو اور ان کے ۵۷ ممالک کو مستقل نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ ایران میں بھی حجاب کے مسئلے کو مغرب نے ایشو بنایا ہوا ہے اور وہ وہاں لادینی قوتوں کو ہوا دے رہا ہے۔

ہماری سوچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی اس میں نہیں کہ وہ اس دنیا کی مانیں اور اس مذہب گریز فکر کے مطابق اپنے آپ کو بدلیں جس پر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کا غلبہ ہے اور اس تہذیب کے علمبردار طاقتور مغربی ممالک اسے دنیا میں ہر قیمت پر، طوعاً و کرھاً، نافذ کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کی کامیابی (دنیا وآخرت میں) اس امر پر ہے کہ وہ اسلامی اصول واقدار پر ڈٹے رہیں اور ان پر یکسوئی سے عمل کریں اور مغربی استعمار کے شور وغوغا کی پروانہ کریں۔

مثلاً عورتوں کے بارے میں مغربی ممالک اور ان کی تہذیب کے جو اصول واقدار ہیں وہ اسلام مخالف ہیں لہٰذا مسلمانوں کو اور طالبان کو انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور دنیا کے سامنے متبادل نظام حیات اور طریق کار رکھنا چاہیے۔ مغرب زدہ مسلمانوں اور مسلم ممالک کو بھی طالبان کو یہ مشورہ نہیں دینا چاہیے کہ وہ عورتوں کے بارے میں مغربی نقطۂ نظر کو اپنانے پر غور کریں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ اسلامی اصولوں پر ڈٹے رہیں اور اسے روبہ عمل لا کر دکھائیں۔ خواتین کی تعلیم اور ملازمت کے حوالے سے طالبان کو چاہیے کہ وہ متبادل اسلامی طریق کار وضع کر کے اس پر عمل کر کے دکھائیں تاکہ اُس کے مثبت اثرات دنیا پر واضح ہوں۔

تاہم ان کے اہل علم اور قائدین کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مقامی اعراف وعادات بعض اوقات اسلامی تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتیں لہٰذا انہیں ترجیح اسلامی اصول واقدار کو

دینی چاہیے نہ کہ مقامی رسوم ورواج کو۔ بلکہ انہیں حکمت اور تدریج کے ساتھ ایسے مقامی رسوم ورواج کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سنت خلفائے راشدین سے ثابت ہے کہ جہاں گنجائش ہوتی وہ اَیْسَر یعنی آسان ترین کو اختیار فرماتے تھے۔ تیسری بات یہ کہ قانون سازی اور جبر کے ذریعے اسلامی تعلیمات واحکام پر عمل کرانے سے پہلے اصلاح کا کام مؤثر طریقے سے اور لمبی مدت تک کرنا چاہیے۔ اس کے لیے تعلیم وتربیت، ابلاغ عامہ کے ذرائع اور تزکیۂ نفوس کا اہتمام واستعمال ناگزیر ہے جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ اگر مجھے حکومت ملے تو پہلے دس سال تک اصلاحی کوششیں کروں گا پھر اقتدار کی قوت سے اس کے نفاذ کا سوچوں گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان حکمرانوں کو عورتوں کے بارے میں اسلامی اصولوں پر ڈٹے رہنے کے ساتھ ساتھ ان تین اسلامی اصولوں پر بھی عمل کرنا چاہیے تا کہ اسلامی اصولوں کی صحیح اور متوازن تصویر دنیا کے سامنے آسکے۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔

بقیہ: مغرب کا معاشی نظام ایک سراب ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے ایک سو سال بعد پیدا ہونے والے امام ابو یوسف کی تصنیف ''کتاب الخراج'' نہ صرف یہ کہ معاشی اور مالیاتی نظام کے اُصول بتاتی ہے بلکہ معاشی قوانین بھی اس میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ان کے بعد الفارابی (873-950ء)، ابنِ سینا (980-1037ء)، الغزالی (1058-1111ء)، ابن تیمیہ (1263-1328ء) اور ابنِ خلدون (1364-1342ء) جیسے لاتعداد اہلِ علم کی ایک لڑی ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں باقاعدہ اسلامی معیشت پر نہ صرف مضمون باندھے بلکہ اس کے بارے میں تفصیلاً لکھا۔ اہم بات یہ ہے ان تمام مسلمان مفکرین نے یونانی علوم کے معاشی حصوں پر بھی باقاعدہ سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اس کے مقابلے میں اسلامی نظامِ معیشت کو نہ صرف پیش کیا بلکہ یہ تک بتایا کہ یونانی مفکرین کے اُصولِ معیشت تو صرف خلائی باتیں ہیں جبکہ اسلامی اُصولِ معیشت تو اس وقت آدھی دنیا پر نافذ ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ اسلام ہی دنیا کو پہلا معاشی نظام عطا کرنے والا دین ہے۔

تفہیم دین　　ڈاکٹر محمد امین

اسلام کا معاشی نظام کہاں ہے؟

مسلمان علماء اور سکالرز اس کے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے عصر حاضر میں مسلمانوں کے لیے اجتماعی نظام مرتب نہیں کیے اور مسلمان حکمران اس کے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے ایسے نظام نہ مرتب کرائے ہیں اور نہ ان پر عمل کرنے کو تیار ہیں

یہ بات اگر کوئی مغرب گزیدہ کہے اور مقصد اس کا یہ ہو کہ ہمیں مغرب کے نظام سرمایہ داری کی اندھی تقلید کرنی چاہیے کیونکہ اسلام کا اور مسلمانوں کا تو کوئی معاشی نظام ہے ہی نہیں، تو ظاہر ہے یہ بات لاعلمی اور حماقت پر مبنی ہے۔ لیکن اگر کوئی سادہ اور مخلص مسلمان آج علماء کرام اور اسلامی سکالرز سے پوچھے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور وہ کہاں نافذ ہے؟ تو ظاہر ہے عصر حاضر کے مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی جواب موجود نہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے تین باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے:

ایک: یہ کہ اسلام عقائد، عبادات اور اخلاقیات کے بارے میں تو تفصیلی احکام دیتا ہے لیکن معاملات، (جیسے معاشی نظام، سیاسی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) کے بارے میں اس نے ازراہِ حکمت وشفقت تفصیلی احکام مسلمانوں کو عطا نہیں کیے بلکہ خود کو ایسے بنیادی اصولوں تک محدود رکھا جو ہمیشہ کے لیے صحیح اور قابل عمل ہیں اور مسلم اہل علم کو اجازت دی کہ وہ اجتہاد کر کے اپنے حالات وضروریات کے مطابق تفصیلات وضع کر لیں۔ یوں مسلمانوں کا معاشی نظام (سیاسی نظام اور دوسرے نظام) وجود میں آتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین نے جو معاشی نظام وضع کیا وہ اتنا کامیاب تھا کہ حضرت عمرؓ مدنی معاشرے میں دولت کی کثرت دیکھ کر پریشان ہوجاتے تھے اور پھر ایک صدی کے اندر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جب ان کے دو گورنروں نے انہیں لکھا کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں، اس پیسے کو ہم کہاں خرچ کریں؟ یہ معاشی نظام، ہزار بارہ سو سال تک کامیابی سے چلتا رہا جس کی وجہ سے مسلمان حکومتیں کامیاب، طاقتور اور غالب تھیں۔ لہٰذا

یہ کہنا کہ اسلام نے کوئی معاشی نظام نہیں دیا، لاعلمی اور حماقت پر مبنی ہے۔

دوسرے: مسلمانوں نے اجتماعی زندگی کے جتنے سٹرکچر بنائے تھے وہ اس وقت ختم ہو گئے جب مصطفیٰ کمال اتاترک نے یورپی طاقتوں کے زیر اثر خلافت کا نظام ختم کر دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک ہزار سال تک دنیا پر حکومت کرنے کے بعد مسلمانوں کا نظام تعلیم وتزکیہ جوان کی ذہن سازی، ان کے ایمان اور تعمیر شخصیت کا بنیادی وسیلہ تھا وہ غیر مؤثر ہو چکا تھا اور اجتماعی اداروں کی تجدید وتشکیل نو میں بھی وہ ناکام ہو گئے تھے اور اسی وجہ سے وہ زوال پذیر ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان ممالک یورپی استعمار کے شکنجے سے کسی حد تک آزاد ہو گئے لیکن فکری طور پر مکمل آزاد ہو سکے اور نہ عملاً۔ چنانچہ مغرب زدہ مسلمان حکمران طبقوں نے مغرب کے معاشی نظام کی پیروی جاری رکھی اور مغرب سے شعوری ولاشعوری طور پر مرعوب مسلمان اہل علم نے مغرب کے نظام معیشت وسیاست میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے ان کے مبنی بر کفر نظام معیشت کو'اسلامی بینکنگ' اور ان کی جمہوریت کو'اسلامی جمہوریت' کہنا شروع کر دیا اور یہ نہ سوچا کہ حق اور باطل کو جمع نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں مفاہمت ممکن ہے۔ جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان اہل علم اکٹھے بیٹھتے اور قرآن وسنت، امت کے بارہ سو سالہ علمی وعملی تجربات اور عصری ضرورتوں کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کا نیا معاشی نظام اور اسی طرح سیاسی، تعلیمی، عدالتی نظام وضع کرتے۔ بدقسمتی سے یہ کام ابھی تک امہ کی سطح پر تو کیا کسی ایک مسلمان ملک کی سطح پر بھی نہیں ہو سکا (انفرادی طور پر بعض اہل علم نے کوششیں ضرور کی ہیں)۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن وسنت میں اسلام کی معاشی تعلیمات تو موجود ہیں لیکن عصر حاضر میں اسلام کا یا مسلمانوں کا تفصیلی معاشی نظام (اور دوسرے نظام) اس وقت کہیں موجود نہیں ہیں۔ ان کو مرتب کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ مسلم امہ کو چاہیے، ہر مسلمان حکمران کو چاہیے، علماء کرام اور اسلامی سکالرز کو چاہیے کہ وہ یہ کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں جوان کی ایمانی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے۔

تفہیم دین

سید خالد جامعی

'خیر القرون'۔ایک مثالی اسلامی معاشرہ (۳)

یہ ہماری اور دینی جماعتوں کی نالائقی اور بد قسمتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو 'خیر القرون' جیسا معاشرہ نہ بنانے کو تیار ہیں اور نہ اس کے لیے کوشاں ہیں

علمِ دین عہد رسالت میں کیسے حاصل کیا جاتا تھا اور اس طریقے سے حاصل کرنے والوں کو کن شدید آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا، کن اصولوں کی پاسداری کرنی ہوتی تھی اور پھر ان اہل علم کا مرتبہ امت میں کیا ہوتا تھا؟ اس کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی دیکھیے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک چھپڑ ڈلوا کر علم دین سیکھنے والوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ اصحابِ صفہ تھے۔ یہی ان کی رہائش گاہ اور درس گاہ تھی جس کے معلم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ علمِ الٰہی، علمِ دین اور علمِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاملین ان طالبان کی کفالت اہلِ مدینہ کے ذمہ تھی۔ ان کو کسی سے سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ خواہ کچھ بھی گزر جائے اور کیا کیا زمانے ان پر نہیں گزرے؟ بھوک، نقاہت، غربت، فقر و فاقہ، افلاس۔ غربت اور فاقے کے باعث یہ اصحاب نماز میں کھڑے ہوتے تو گر جاتے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر فرماتے تم لوگوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ تمہارے لیے ان فاقوں کے بدلے اللہ کے یہاں کیا کیا اجر و ثواب ہے تو تم خواہش کرو کہ ان فاقوں میں مزید اضافہ ہو۔[۱] عصر حاضر کے ذہن کے لیے اس زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنے زماں و مکاں میں مقید، محصور اور مسرور ہے۔ تعقلِ غالب اس طرزِ زندگی سے ہم آہنگ ہے لہٰذا یہ قابل قبول نہیں۔ صفہ میں بہت سے طالبانِ دین تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی انہی میں سے ایک طالب علم تھے۔ اکثر بھوک سے بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ صحابہ سمجھتے کہ مرگی کا دورہ ہے حالانکہ یہ حالت بھوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔[۲] اس فقر و فاقہ اور قربانی کا صلہ یہ نکلا کہ آپ نے سب سے زیادہ

[۱] جامع ترمذی باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[۲] جامع ترمذی، محولہ بالا

احادیث روایت کیں۔ان کی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔[۱] حضرت ابو ہریرہؓ ۷ ہجری میں اسلام لائے مگراس کثرت سے آپ کی احادیث کے دو اسباب ہیں۔وہ خود بیان فرماتے ہیں کہ:

''مَیں ہمیشہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا۔نہ اچھا کھانا کھاتا تھا اور نہ اچھا کپڑا پہنتا تھا اور نہ کسی سے خدمت لیتا تھا۔بھوک کے باعث کبھی کبھی مجھے اپنے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جانا پڑتا تھا۔کبھی فرماتے "کُنْتُ رَجُلًا مِسْكِينًا، أَخْدُمُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى مِلْءِ بَطْنِي، وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بالأَسْوَاقِ وَكَانَتِ الأَنْصَارُ يَشْغَلُهُمُ الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ"[۲] میں ایک مسکین شخص تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا تھا اور درِ دولت ہی سے کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔حضرات مہاجرین تجارت میں مشغول رہتے اور انصاری صحابہ اپنے اموال (باغات) میں (اس لیے مجھے آپ کی احادیث واقوال محفوظ کر لینے کا زیادہ موقع میسر آیا)۔

دوسری وجہ حضرت ابی بن کعبؓ یہ بتلاتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے سوالات کر لیا کرتے تھے جن کی ہمت ہم میں سے کوئی نہیں کر سکتا تھا۔[۳] علم دین جو اصل علم 'العلم' ہے، حضرت ابو ہریرہؓ اس کے اس قدر حریص تھے کہ دنیا کی ساری نعمتیں ان کے نزدیک اس علم کے سامنے ہیچ تھیں۔ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی غربت ،خستہ حالی، مسکینی ،فقر وفاقہ کشی کے پیش نظر بلایا اور فرمایا: ابو ہریرہؓ غنیمت کے ان اموال میں سے کچھ چاہتے ہو؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس غربت وافلاس کے عالم میں جواب دیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے وہ علم عنایت فرما دیجیے جو اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا ہے۔[۴] رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے ذوق وشوق کے پیش نظر آپ کے لیے دعاء بھی کی اس لیے آپ کا حافظہ بہت مضبوط تھا۔محدثین آپ کو 'احفظ اصحاب محمد' اور 'احفظ من روی الحدیث فی عصرہ' کہتے ہیں۔ایک بار حضرت ابو ہریرہؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھول جانے کی شکایت کی کہ آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں لیکن یاد نہیں رہتیں۔تو آپ نے

---

[۱] اصابہ، ج ۷، ص ۲۰۱

[۲] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۴۹۲

[۳] اصابہ، ج ۷، ص ۲۰۲

[۴] اصابہ، ج ۷، ص ۲۰۴

فرمایا: اپنی چادر پھیلاؤ۔ مَیں نے چادر پھیلا دی اس پر آپ نے کچھ پڑھا پھر آپ کے حکم سے میں نے اسی چادر کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس دن کے بعد سے میں آپ کی کوئی بات کبھی نہیں بھولا (۱) حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے تھی کہ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کثرت سے روایتیں نقل نہیں کرتا جس کثرت سے مَیں نقل کرتا ہوں البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ مجھ سے زیادہ روایات نقل کرتے تھے اس لیے کہ وہ لکھتے تھے اور مَیں نہیں لکھتا تھا'' فانہ کان یکتب وانالا اکتب (۲) حیرت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حفظ کردہ روایات کی تعداد حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ سے بہت زیادہ ہے۔

حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ سے کسی نے کہا کہ کیا ابو ہریرہؓ نے واقعی آپ لوگوں سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہیں یا یوں ہی روایت نقل کرتے ہیں؟ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا انھوں نے واقعی وہ روایات آپ سے سنی ہیں جو ہم لوگوں نے نہیں سنی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسکین شخص تھے، مال و دولت ان کے پاس نہ تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہمان تھے۔ آپ ہی کے ساتھ کھاتے پیتے تھے، اور ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے اور ہم لوگ اہل وعیال اور مال ومتاع والے تھے۔ ہماری حاضری صرف صبح شام ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو روایات وہ بیان کرتے ہیں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی سنی ہیں اور ہم اپنے مشاغل کی وجہ سے ان سے محروم رہ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی ایک موقع پر کہا ابو ہریرہؓ ہم لوگوں کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں زیادہ رہتے تھے اور آپ کی احادیث زیادہ محفوظ رکھتے تھے (۳)۔ اسلامی تہذیب و تاریخ میں علمِ دین اگر مال و دولت کی حرص اور دنیا طلبی کی ادنیٰ سی آرزو کے بغیر اس مجاہدانہ و درویشانہ طریقے سے حاصل ہو تو پوری امت کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنتا ہے لیکن جب دین کے عالم اور معلمِ دین کو دنیا کمانے کے لیے استعمال کریں۔ بڑے علماء ان مدارس میں کام کرنا پسند کریں جہاں تنخواہ زیادہ ملتی ہو اور علماء مدارس میں تدریس ترک کر کے اسلامی بینکوں کی ملازمت اختیار کر لیں کہ مدارس میں تنخواہ بہت کم ہوتی ہے اور طلباء ان مدرسوں کا انتخاب کریں جہاں وظیفے زیادہ ہوں، رہائش کی سہولتیں عمدہ ہوں اور کھانے پینے کا اعلیٰ معیار ہو۔ اور مدارس طلباء کو راغب کرنے کے لیے

---

(۱) صحیح مسلم و جامع ترمذی ابواب المناقب والفضائل
(۲) صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم
(۳) جامع ترمذی مناقب ابی ہریرہؓ

اشتہارات شائع کریں اور اپنے اشتہارات میں طلباء کو دعوت دیں کہ ان کے یہاں بھاری وظیفہ ملتا ہے، ایئر کنڈیشنڈ درسگاہیں ہیں، کھیل کے میدان، سوئمنگ پول اور باغات ہیں اور علم دین بھی ہے تو ان رویوں کے نتیجے میں جو علمِ دین حاصل ہوگا وہ روح سے خالی اور دنیا کی لذتوں اور دلچسپیوں سے معمور ہوگا۔ یہ علم نہ فرد کی آخرت بدل سکتا ہے نہ امت کی تقدیر۔ ایسے علم سے پناہ مانگنے کی ضرورت ہے جس کا تقاضا دنیا کے لیے ہو اور جو صرف دنیا سے تمتع کو سہل بنا دیتا ہو۔

صرف علم سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس کے ساتھ ساتھ خشیت اور خشوع وخضوع درکار ہے۔ انہی حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں ابوعثمان الہندی تابعی کہتے ہیں کہ میں ایک بار سات دن تک حضرت ابو ہریرہؓ کے یہاں مہمان رہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اور ان کی اہلیہ اور خادم نے رات کے تین حصے کر لیے ہیں۔ باری باری ایک ایک شخص اپنے حصۂ شب میں جاگتا ہے اور یہ ان لوگوں کا مستقل معمول ہے۔ [۱] حضرت عمرؓ نے انہیں بحرین کا عامل بنا دیا تھا لیکن جلد ہی آپ نے ان خدمات سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ دوبارہ حضرت عمرؓ نے عامل بنانا چاہا تو انکار کر دیا۔ دنیا سے اس قدر لاتعلقی کے باوجود وفات سے پہلے آپ رونے لگے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا ''سفر سخت ہے اور زادراہ کم ہے''۔ انہیں خوفِ آخرت تھا ورنہ ان کے پاس زادِراہ کم نہ تھا۔ اگر ان کے پاس کم تھا تو پھر کس کے پاس زیادہ ہوگا؟ کیا امت مسلمہ کے پاس ایسے شیخ الحدیث موجود ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو یہ امت زوال کے اندھیرے سے کبھی نہیں نکل سکتی! آج کے دین دار امراء اور لوگوں کے خدام ایسے ہوں گے کہ وہ رات کو عبادت کے لیے تیار ہوں؟ ان امراء کا خدام کے ساتھ رویہ کیا ہے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے امراء کے گھروں میں ڈکیتیاں، چوریاں، قتل وخون، اغواء کی وارداتیں انہی خدام کے ذریعے ممکن بنائی جاتی ہیں جن کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ امراء اخوت اسلامی کو ملحوظ رکھتے تو یہی خدام ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کرتے لیکن اخوتِ اسلامی صرف لفظ کی سطح پر ہے، عملی زندگی اخوت کے اس روحانی تصور سے خالی ہے جو 'مواخات' کے ذریعے تاریخ کے صفحات میں قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے اس سطح کی مواخات تو ممکن ہی نہیں۔ عصر حاضر میں امراء کی جانب سے ہمدردی، محبت اور انفاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ سطح بھی گھروں کے خدام کے لیے روا نہیں رکھی جاتی۔ ہماری معاشرت

---

[۱] اصابہ، ج ۷، ص ۲۰۶

سرے سے اسلامی ہے ہی نہیں۔

حضرت زید بن حارثہؓ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم اور غلام تھے۔ ان کے والد اور چچا کو ان کا سراغ ملا تو وہ مکہ آئے اور فدیہ کے لیے زر کثیر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کیا۔ آپ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور فرمایا ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ اپنے والد اور چچا کو انھوں نے پہچان لیا۔ آپ نے ان سے کہا کہ اپنا مال اپنے پاس رکھو یہ زید ہیں اگر یہ تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہیں تو انھیں اختیار ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کی گردن سے غلامی کا طوق اتار دیا مگر حضرت زیدؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا طوقِ غلامی دوبارہ گلے میں ڈال لیا اور اپنے باپ و چچا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ حضرت زیدؓ کی اس محبت کے باعث رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرم شریف میں قریش کو گواہ بنا کر نہیں اپنا بیٹا قرار دیا۔ وہ زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہلانے لگے۔ کیا عہدِ حاضر کے دین داروں کے لیے خدام و غلام سے برتاؤ کے اس واقعے میں کوئی سبق ہے؟ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس غلام اور خادم کو بیٹا بنانے کے بعد ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ غزوۂ موتہ کا لشکر جو ۸ھ میں روانہ ہوا اس کے امیر آپ ہی تھے۔ آپ نے ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کرا دی۔ طلاق کے بعد آپ نے والد کی باندی سے ان کا نکاح فرمایا جن سے حضرت اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔ اس غلام اور خادم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا حال یہ تھا کہ ایک بار وہ کہیں باہر سے مدینہ طیبہ آئے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ زید نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ اتنی سرعت کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے نکلے کہ آپ کی چادر جسم مبارک کے نیچے کھسک گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے گھسیٹتے ہوئے ہی باہر نکل گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی آپ کو اس حالت میں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔ ان کی بہادری اور قائدانہ صلاحیت کے باعث جس غزوہ میں حضرت زیدؓ تشریف لے جاتے لشکر کا امیر انہی کو بنایا جاتا۔ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود غزوہ میں جاتے تو مدینہ میں حضرت زیدؓ کو اپنا نائب بنا کر جاتے۔[۱] (جاری ہے)

---

[۱] جامع ترمذی، باب ماجاء فی المعانقة والقبلة، فتح الباری، ج ۷، ص ۸۷، بحوالہ سنن نسائی

ڈاکٹر محمد امین

تفہیم دین

علماء کرام اور دینی عناصر غور فرمائیں

پاکستان میں غلبۂ اسلام بذریعہ قانون سازی؟

کیا 'شریعت' کو 'قانون' کے تابع کر کے اسلام نافذ ہوسکتا ہے اور غالب آسکتا ہے؟
اور کیا فرد کو تبدیل کیے بغیر ریاستی قانون سازی مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے؟

[۲۴ دسمبر ۲۰۲۲ء کو آسٹریلیا مسجد لاہور میں تحریکِ انسدادِ سود کے حوالے سے سارے دینی مکاتب فکر کے اجلاس میں مدیر البرہان کا اظہارِ خیال]

ہم ان علماء کرام کے شکر گزار ہیں جو انسدادِ سود کی تحریک چلا رہے ہیں اور ان دینی عناصر کے بھی جو اس کیس کو وفاقی شرعی عدالت میں لے کر گئے، طویل جدوجہد کے بعد اس عدالت سے سود کے خلاف فیصلہ لیا اور اب اس کے حکومتی سطح پر نفاذ کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کی یہ جدوجہد بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ راقم بھی اس تحریک میں آپ لوگوں کا ادنیٰ خادم ہے بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ تحریکِ انسداد سود اس 'انسدادِ سود کمیٹی' کی ہی توسیع شدہ شکل ہے جو ملی مجلس شرعی نے قائم کی تھی اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کو اس کا کنوینر مقرر کیا تھا۔ راقم نے ملی مجلس شرعی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اس کمیٹی کی تشکیل کا نوٹیفکیشن ۱۴ فروری ۲۰۱۴ء کو جاری کیا تھا۔

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسدادِ سود کے سلسلے میں آپ کی یہ کاوشیں محمود ہیں اور آپ ان کوششوں کے لیے مستحق تبریک ہیں اور مَیں اس تحریک میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں اور آپ کے ساتھ ہوں لیکن آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آپ اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام اور غلبۂ اسلام کا یہ کیا طریقہ ہے جس میں شریعت کا نفاذ اس امر کا محتاج ہے کہ اسمبلی اسے 'قانون' کی صورت میں منظور کرے اور عدالت اس کی توثیق کرے؟ علماء کرام نے اور دینی جماعتوں نے یہ سسٹم کیوں منظور اور قبول کیا ہوا ہے کہ 'شریعت' انسانوں کے بنائے ہوئے 'قانون' کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سود حرام ہے

لیکن پاکستان میں سود اس وقت تک حرام نہیں ہوسکتا جب تک اسمبلی اس کے لیے ’قانون‘ پاس نہ کرے اور اگر یہ معاملہ عدالت میں جائے تو یہ قانون اس وقت تک قانون نہیں رہ سکتا جب تک عدالت اس کی توثیق نہ کرے۔ یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ عجیب مذاق ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ سود حرام ہے لیکن مملکت خداداد پاکستان جس میں ۹۷.۳ فیصد مسلمان رہتے ہیں، ان کے لیے اس حکم شرعی پر عمل نہیں ہوسکتا جب تک انسانوں کی بنائی ہوئی اسمبلی اس پر ’قانون‘ پاس نہ کرے۔ گویا شریعت پر عمل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اسمبلی اسے منظور کرے۔ دوسرے لفظوں میں شریعت تابع ہے اس اسمبلی کے اور اس کی قانون سازی کے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

اور یہ معاملہ اگر عدالت میں چلا جائے تو پاکستان کی عدالتیں آج تک ہزاروں مقدمات میں سود کے حق میں فیصلے کرتی رہی ہیں کیونکہ یہ ’’مطابقِ قانون‘‘ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ وفاقی شرعی عدالت بھی اس کے خلاف فیصلہ دے دے تو پھر کیا ہوگا؟ پھر شریعت کی حیثیت کیا ہوگی؟ (یاد رہے کہ اس سے پہلے وفاقی شرعی عدالت نے اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیل بنچ نے موجودہ جاگیرداری نظام کو اسلامی قرار دیا تھا تو علماء نے کیا کرلیا تھا؟) تو یہ شریعت کے ساتھ کیسا مذاق ہے جو ہم کر رہے ہیں؟

پھر علماء کرام اور دینی جماعتیں اس پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ’قانون‘ شریعت کے مطابق بن بھی جائے تو نہ عوام اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ حکومت۔ نجی طور پر سود کے خلاف قانون سازی عرصہ ہوا پنجاب اسمبلی کر چکی ہے (یہ کہنا کہ نجی طور پر سود لینا دینا حرام ہے اور اس کا اطلاق بنکوں اور حکومتی اداروں پر نہ کرنا گویا اس امر کی اجازت دینا ہے کہ سود لینا دینا نجی طور پر تو حرام ہے لیکن بنکوں اور حکومتی اداروں کو اجازت ہے کہ وہ سودی لین دین کرتے رہیں) لیکن عوام اس پر عمل نہیں کر رہے اور معاشرے میں سود کا لین دین جاری ہے۔ تجارت میں بھی اور عام ضرورت مندوں کے لیے بھی اور حکومت اس پر عمل کروا بھی نہیں رہی۔ کیا آپ نے کبھی سنا کہ کسی سود خور کو عدالت نے سزا دی ہو؟

اسی طرح کئی قوانین مطابقِ اسلام بنے ہوئے ہیں لیکن حکومت ان پر عمل نہیں کرتی مثلاً

۱۹۷۹ء سے حدود قوانین آئینِ پاکستان کا حصہ ہیں لیکن آج تک کسی حکومت نے ان پر عمل نہیں کیا۔ کسی شرابی کو آج تک کوڑے نہیں لگے، کسی چور کا ہاتھ نہیں کٹا اور کسی زانی کو رجم نہیں کیا گیا؟ سوال یہ ہے کہ اسلامی قوانین بنانے کا فائدہ کیا ہے اگر حکومت نے ان پر عمل نہیں کرنا؟ اور المیہ یہ ہے کہ اس پر ہر سو خاموشی ہے۔ علماء کرام اور دینی جماعتوں نے کبھی اس پر شور نہیں مچایا، کبھی تحریک نہیں چلائی کہ ان اسلامی قوانین پر عمل درآمد کرو! کیوں؟ یہ معاملہ کبھی کسی عدالت میں بھی نہیں گیا اور نہ کبھی کسی عدالت نے حکومت کو حکم دیا ہے اور اسے مجبور کیا ہے کہ ان قوانین پر عمل کرو۔

شرعی قانون کے ساتھ یہ مذاق ہے کہ نہ عوام اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ حکمران؟ اور علماء کرام اور دینی جماعتیں بھی اس پر خاموش ہیں۔ پہلے وہ قانون کو اسلامی بنانے کا مطالبہ کرتی تھیں اور آج کل جو بن چکے ہیں ان کے تحفظ کا مطالبہ کرتی ہیں اور مزید قوانین کو اسلامی بنانے کا مطالبہ کرتی ہیں جیسے سود کو خلاف اسلام قرار دینا۔ ہم کہتے ہیں کہ فرض کیجیے کہ حکومت سود کے خلاف قانون بنا دیتی ہے اور اس پر عمل نہیں کرتی جس طرح وہ حدود قوانین پر عمل نہیں کر رہی۔ جس طرح زکوٰۃ وعشر کے قانون پر مؤثر طور پر عمل نہیں کر رہی تو پھر آپ کیا کریں گے؟

مطلب یہ کہ آپ کی یہ سوچ اور پالیسی ہی ناقص اور قابل نظر ثانی ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت اور غلبۂ دین کا طریقہ یہ ہے کہ قوانین کو اسلامی بنایا جائے۔ آپ تعلیم وتربیت، دعوت واصلاح، تزکیہ اور میڈیا کے ذریعے افراد کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ اس ملک کے حکمران بھی اسی دیس کے باسی ہیں اور مسلمان ہیں، آپ نے ان کی ذہن سازی اور ان کی اسلامی تعلیم وتربیت کے لیے آج تک کیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے سارے انبیاء کو خصوصاً آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دین کی اشاعت اور اس کی کامیابی اور غلبے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ تو ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ'' تھا، اس پر تو آپ فوکس نہیں کرتے اور ساری کوششیں اس امر پر مرکوز کیے ہوئے ہیں کہ ریاست قوانین کو اسلامی بنا دے۔ بھئی! بنا دے اسلامی۔ لیکن اگر عوام اور حکمران اس پر عمل نہ کریں تو پھر آپ کیا کریں گے؟ پھر اس کا حاصل کیا ہے؟

تفہیم دین

ڈاکٹر محمد امین

'امت' کا تصور کہاں کھو گیا

'خلافت' کے لفظ کو کس نے گالی بنا دیا؟

ہم پوچھتے ہیں امت اسلامیہ سے اور خصوصاً ملت اسلامیہ پاکستان سے کہ کیا اسے ادراک ہے کہ اس کا دشمن کون ہے اور دوست کون؟ اس کی بھلائی کس امر میں ہے اور نقصان کس میں؟

کیا اسے یاد ہے کہ:

* جنگ عظیم اوّل سے پہلے کس نے عربوں کو ترکوں سے لڑایا تھا؟

* پھر جنگ میں ترک عثمانیوں کی شکست کے بعد کس نے ان کی سلطنت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اسے غلام بنا لیا تھا؟ کس نے ان کے ممالک کو لوٹا اور کچلا تھا؟

* کس نے ترکوں میں سیکولرزم، لبرل ازم اور ماڈرنزم پھیلا کر انہیں مغرب کی اندھی پیروی کرنا سکھایا اور ان سے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کرایا؟

* کس نے مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو کچلا؟ قائدین کو جیلوں میں ڈالا، اذیتیں دیں، ظلم و جبر کی سیاہ رات ان پر مسلط کی؟

* پھر جب دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی داخلی کمزوریوں اور آزادی کی تحریکوں کی وجہ سے اسے مسلم ممالک کو آزاد کرنا پڑا تو کس نے اب 'امن کا چولا' پہن لیا لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں جاری رکھیں؟

* کس نے کوشش کی کہ مسلم حکمران ان کی مرضی کے ہوں، جو ان کی پالیسیوں کو نافذ کریں اور اس کی تہذیب کی پیروی میں اپنی نجات سمجھیں؟

* کس نے مسلم حکمرانوں کو رشوت اور بدعنوانی کی چاٹ لگائی، انہیں کِک بیکس دیں

اوران کے ملکوں کوسودی قرضوں میں جکڑ کر مسلم عوام کومہنگائی کے عذاب میں مبتلا کیا تا کہ وہ بھوکے مریں اورذلت کی زندگی جیئیں؟

* وہ کون ہے جومسلم امت کومتحد نہیں ہونے دیتااورجتنی تنظیمیں اس مقصد سے بنتی ہیں انہیں بے ہوشی کے انجیکشن لگا کرگہری نیندسلا دیا جاتا ہے؟

* کس نے حیلوں بہانوں سے عراق،افغانستان اورلیبیا کوتباہ کیا؟

* کس نے جنوبی سوڈان کوسوڈان سے، جزیرہ تیمورکوانڈونیشیاسےاورمشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنے اور بڑے مسلم ممالک کوتوڑنے کی سازش کی؟

* کون ہے جوفلسطین، کشمیر، برماکے مسلمانوں کے مسئلےحل نہیں ہونے دیتا؟

* کون شیعہ سنی کولڑا کرشام اوریمن کو برباد کرر ہاہے؟

* کس نے پاکستان،ایران،سعودی عرب،ترکی،مصرجیسے بڑے ممالک کوشدید دباؤمیں رکھاہواہےاوران کےخلاف سازشیں عروج پرہیں؟

* کس نے شاہ فیصل، جنرل ضیاءالحق اورصدرمرسی کومروایا؟

* کس نے شروع ہی سے پاکستان کی اشرافیہ اورحکمران طبقات (سیاستدان،عدلیہ، فوج، بیوروکریسی) کوغلامی کے جال میں جکڑاہواہے؟

* پاکستان میں اس وقت جوسیاسی اورمعاشی بحران ہے،اس کے پیچھے کون ہے؟

* کون ہے جواسلامی جمہوریہ پاکستان اورمسلم ایٹمی ملک کوکمزورکرنااورختم کرنا چاہتا ہے؟

ہم نے جتنے سوالات کیے ہیں اورجس طرح کیے ہیں کیااس کے بعدبھی یہ کوئی پہیلی ہے کہ آپ ہمارے سوالات کا جواب نہیں دے سکتے؟ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والاشخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان سارے کاموں کے پیچھے امریکہ ویورپ ہیں جواسلام اورمسلمانوں کے دشمن ہیں، جو ہر قیمت پر اپنی فکروتہذیب کا غلبہ چاہتے ہیں، جومسلمانوں کو اسلام سے دور کرنا

چاہتے ہیں، جو مسلمانوں کو غلامی، رسوائی، ذلت، کمزوری اور پسماندگی کے گڑھے سے نکلنے دینا نہیں چاہتے۔

کیا اب بھی آپ اپنے دشمن کو نہیں پہنچانتے؟ کیا اب بھی آپ اس کے جال سے نکلنا نہیں چاہتے؟ کیا اب بھی آپ پاکستان میں اس کے ایجنٹوں سے نجات نہیں چاہتے؟

اگر آپ مسلمان ہیں تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد رکھیے کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ [الرعد ۱۳:۱۱]

یعنی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لہٰذا بیدار ہو جائیے! اٹھ کھڑے ہوئیے! دشمن کی سازشوں کو ناکام بنائیے! مغرب کی الحادی اور کافرانہ فکر و تہذیب کو ردّ کر دیجیے اور اخلاص اور قوت کے ساتھ اسلام کی طرف لوٹ آیئے! خود اسلام پر عمل کیجیے اور پھر دوسرے مسلمانوں کو اور معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق چلنے میں مدد دیجیے بلکہ چلایئے اور چلا کر دکھایئے! پھر یہ پیغامِ رحمت ساری امت تک اور دنیا کے سارے انسانوں تک پہچانے کی کوشش کیجیے۔ اور یاد رکھیے کہ یہ کام محض خواب دیکھنے سے نہیں ہوگا اس کے لیے عملی جدوجہد کرنا ہوگی کیونکہ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین

فکر و دانش

رضی الدین سید[۱]

انسانی آبادی کی منصوبہ بندی

مغربی دانشور خواہ مخواہ باؤلے ہو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کا خالق خود انسانی آبادی کی منصوبہ بندی کر رہا ہے

دنیا بھر کے دانشور حضرات کے نزدیک وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کرۂ ارض کی آبادی اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ کیوں بڑھتی چلی جارہی ہے جبکہ زمین کے وسائل تقریباً ختم ہونے کو آرہے ہیں او یہاں ایک قحط کا سا سماں پیدا ہونے لگا ہے؟۔ ’’ایک خاص مدت کے بعد دنیا کے لوگ آخر کھائیں گے کیا اور پئیں گے کیا؟‘‘۔ تشویش میں مبتلا ہوکر یہ دانشوران اپنے سر پیٹ لیتے ہیں۔

دنیا کے انسانوں کی محبت میں یہ ہے ان کا وہ دکھ جس کے باعث وہ نہ تو رات کو کوئی نیند لیتے ہیں اور نہ دن کو کوئی یکسوئی حاصل کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ موٹی موٹی کتابیں اس مقصد کے لیے لکھتے ہیں بلکہ ہر چھوٹے بڑے ملک سے لے کر اقوامِ متحدہ جیسے ادارے تک کو انتظامی منصوبے تیار کرنے کے مشاغل پر لگائے رکھتے ہیں۔ بھاگ دوڑ بیشک ان کی بہت ہو رہی ہوتی ہے لیکن مقصد ان کا بہر حال یہ نہیں ہوتا کہ وہ عالمی ذرائعِ حیات و وسائل کو مزید بڑھانا، موجودہ وسائل کو مزید ترقی دینا، اور افراد و اقوام کے عیاشانہ اخراجات کو کم کریں گے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیداوار کم کرنے لگ جاتے، بلکہ بالکل ہی روک دینا چاہتے ہیں۔ دانشوروں کے خیال کے مطابق اس مرحلے پر اگر آبادی کو کہیں نہ کہیں روک دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ آج کے لوگوں کے لیے موجودہ ذخیرۂ آب وخوراک کافی ہوجائے گا بلکہ اگر کچھ اور تیزی اس ضمن میں دکھائی جائے تو زندگی عیاشی کے ساتھ گزارنے کا موقع ایک عام آدمی کو بھی نصیب ہوجائے گا۔

دانشوروں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے شہر کے ایک دن میں پیدا ہونے والے دس بارہ

---

[۱] دانشور، مصنف، کراچی، national.a.research@gmail.com

بچوں کو دنیا میں آنے سے اس لیے روک دینا چاہتے ہیں کہ اس سے آبادی میں مزید کچھ کمی واقع ہوگی ،تو جواباً! اگر ان سے عرض کیا جائے کہ اس کے بدلے میں اگر آپ دس بارہ مفکرین خود اپنی ہی زندگی ہمارے خونی اسلحوں کے حوالے کردیں تاکہ مسئلہ اس طرح بھی حل ہوجائے ،تو ہاتھ پاؤں جوڑ کر وہ فوراً اپنے زندہ رہنے کی بھیک مانگنے لگیں گے۔ بلکہ جانوں کا خطرہ زیادہ ہی محسوس کر کے وہ اپنے محبوب نظریوں ہی سے دستبرداری اختیار کرلیں گے۔ حالانکہ آبادی کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یا تو بچوں کی پیدائش کم کردی جائے یا پھر زندہ انسانوں کو قتل کردیا جائے۔ چنانچہ صاحبانِ دانش وبصیرت کا معاملہ مولانا مودودی کے اس تبصرے کا سا ہے کہ ’یہ لوگ خود تو ٹرین کے ڈبے میں کسی نہ کسی طرح گھس کے اندر آگئے ہیں لیکن اب دوسرے مسافروں کو اس میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے‘۔

آبادی کو وسائل سے مطابقت دینے (نہ کہ وسائل کو آبادی سے مطابقت دینے کے لیے) یہ مفکرین اتنے فکر مند رہتے ہیں کہ دن رات نت نئے فارمولے ایجاد کرتے ، ہدایات ورہنمائی وضع کرتے ،اور جدید فلسفے منظرِ عام پر لایا کرتے ہیں۔ کائنات کا تخلیق کرنے والا ان کے خیالات کے مطابق تخلیقِ کائنات کے بعد اپنی تمام ذمے داریاں ،زمین کے فکر مند وعظیم دانشوروں کے سپرد کر کے خود کہیں گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ چنانچہ اب یہ زمینی دانشوروں ہی کی ذمے داری ہے کہ وہ کرۂ ارض کی آبادی کو بڑھنے ، پھیلنے ،اور توسیع دیئے جانے سے روکیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ پوری انسانی زندگی میں آیا فی الحقیقت ایسی کوئی صورتِ حال رونما ہوئی بھی ہے یا نہیں ،حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے کے دو پہلو ساتھ ساتھ منسلک ہیں: آبادی اور وسائل ۔انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مسئلے کو حل کرنا ہے تو اس کے دونوں ہی پہلوؤں پر یکساں توجہ دی جائے۔ یہ نہ ہو کہ مفکرین محض ایک ہی پہلو پر سارا زور دیتے چلے جائیں اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کردیں۔آبادی کا معاملہ حل کریں اور وسائل کا معاملہ غیر حل طلب رکھیں۔ گمبھیر مسائل کو حل کرنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ بھی نہیں ہے۔لیکن حیرت انگیز طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں اس خاص مسئلے کے حل کے لیے بلاتخصیص یہی طریقہء کار اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شور تو بہت سامنے آتا ہے کہ آبادی محدود کر کے ہم نسبتاً ایک بہتر زندگی گزار

لینے کے قابل ہو جائیں گے لیکن ذاتی انسانی قوت وفراست کے ذریعے وسائل میں کوئی قابلِ رشک اضافہ وہ اتنی تیزی اور دانش مندی سے نہیں کر پاتے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے اقدامات کے باعث گزشتہ عشروں میں آبادی میں قابلِ لحاظ کمی تو واقع ہوئی ہے لیکن یہ سوال بھی بہرحال اہم ہے کہ اس کمی کے باعث کیا عام خوشحالی میں بھی کوئی اضافہ ہوا ہے؟ افسوس کہ ہمارے پاس اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ دنیا کے کروڑوں انسان ایسے ہیں کہ غربت کی آخری لکیر سے بھی وہ نیچے کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ دنیا کو فی الواقع اگر محض انسانوں ہی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا تو اندازاً محض سال دو سال ہی میں وہ اس زمین کو مکمل طور پر تباہ کر دیتے جبکہ لاکھوں لاکھ زندہ آدمیوں کا خون بھی وہ زمین پر بیک وقت بہا دیتے، جیسا کہ ہم آجکل دنیا میں عام طور پر دیکھ ہی رہے ہیں۔ انسانوں کے دلوں میں محبت اور جانبداری کا گزر آخر ہے کہاں؟

بات یہ بھی ہے کہ کسی بھی معاملے میں لوگ جب اپنے خالق ہی کو بھول جائیں، جیسا کہ مغرب نے اس ضمن میں ناقابلِ مصالحت رویہ اپنایا ہوا ہے تو بے شمار معاملات میں انہیں غلط نتائج اور گمراہ کن اقدامات ہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صحیح منزل انہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی کیونکہ بعض اقدامات اللہ تعالیٰ کے غیر مرئی ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اس دنیا کا انتظام و انصرام کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے اقدامات جو ایک عام انسان تو کیا، اعلیٰ قسم کے دانشوروں کو بھی نظر نہیں آتے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں کہیں بہت سارے معاملات یکایک بالکل ٹھیک ٹھاک ہو رہے ہوتے ہیں اور کہیں یکا یک وہ بالکل بگڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ دنیا بنا کر اللہ تعالیٰ ایک الگ گوشے میں کہیں تیاگ لے کر بیٹھ گیا ہے، ایک بالکل گمراہ کن اور توہین آمیز نظریہ ہے۔

ایسا خدا جسے کرہ ارض اور انسانوں کی تخلیق کے بعد سے کامل لاپروائی ہو چکی ہو اور جس نے دنیا کا انتظام اپنی ہی پیدا کردہ محدود علم، محدود فراست، اور استحصال پسند مخلوق کے حوالے کر دیا ہو، وہ پھر آخر ''قادرِ مطلق'' کہلائے جانے کا حقدار کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا اس دنیا کا نظام وہ لوگ چلائیں گے جن کے اپنے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں، جن کی ہوسِ دولت اپنی تمام

حدیں پار کر چکی ہے، جن کے دلوں پر نفرتوں اور تعصّبات نے مکمل قبضہ جما یا ہوا ہے اور جنہوں نے دنیا میں جنگوں کو فروغ دینے اور امن کو برباد کر دینے کو خود پر لازم کر لیا ہے؟ چنانچہ انہی کی منصوبہ بندیوں کا نتیجہ ہے کہ اب خود ان کی اپنی نسلوں کے مٹنے کا سامان بھی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے۔

کائنات کا حقیقی خدا تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور اپنی All seeing eye سے دنیا کی ایک ایک کارکردگی پر ہمہ دم نظر رکھے ہوئے ہے۔ سب سے بڑی سچائی ہے ہی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بڑی اور زبردست منظم ہستی کائنات میں کوئی دوسری ہے ہی نہیں اور صرف اسی کو یہ فیصلہ زیب دیتا ہے کہ دنیا کے معمورے میں وہ کس قدر افراد کو بھرے اور کس قدر ذرائع و وسائل کی فراہمی ان کے لیے ضروری سمجھے! نیز یہ کہ کتنی شرح پیدائش یہاں رکھی جانی چاہیے اور کتنی شرح اموات؟ یہ اور ان جیسے بیسیوں سوالات ہیں جن کی فکر اسے ہمہ دم لگی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ اس کے حسنِ انتظام ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی آبادی آج تک اس انتہا تک نہیں پہنچ سکی ہے جہاں جا کر کہا جا سکتا ہو کہ بس اس کے بعد تو ایک فرد کی بھی گنجائش زمین پر نہیں رہ گئی ہے۔ اور اگر اب ایک بھی نیا فرد یہاں اترا تو زمین ڈانوا ڈول ہو جائے گی اور سب کچھ تباہی و بربادی کا شکار ہو جائے گا۔

کیا ہم دیکھتے نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ وسائل میں ہر نئے دن کوئی نہ کوئی حیرت انگیز اضافہ کر رہا ہوتا ہے بلکہ آبادی کے بارے میں تو مستقل منصوبہ بندی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ وہی جس نے دنیا کے لیے پیٹرول کی دولت عطا کی، گیسوں کے ذخائر اجاگر کئے، تیز ترین نقل و حمل کے فضائی طیاروں کو سامنے لایا، جدید ترین ٹیکنالوجی کے الہام کے باعث نہ صرف یہ کہ زمینوں سے فصلوں میں معجزے اگانے شروع کئے، بلکہ ہر ہر میدان میں انقلاب جیسی صورتِ حال جنم دلوائی۔ اور یہ کہ مرغبانی اور ماہی گیری کے کاروباری استعمالات اس نے شروع کروائے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ آبادی منصوبہ بندی کی فکر آج کے انسانوں سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ کو ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا یہ تبصرہ غلط ہے؟

دنیا کی تاریخ میں کب یہ ہوا ہے کہ وسائل گھٹ گئے ہوں اور آبادی بھوکی مر گئی ہو اور

آب و دانہ ختم ہوگیا ہو اور لوگ چیختے چلاتے پھر رہے ہوں؟ اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ انسانوں کی اپنی غلط منصوبہ بندیوں ، اور انسانوں اور انسانوں کے درمیان روا رکھے جانے والے تفریقی رویوں کے باعث ہوا ہے۔ دنیا کے انسانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کبھی تفریق نہیں کیا کرتا۔ اس کے نزدیک یورپ کے خوشحال لوگ زمین پر رہنے کے جس قدر حقدار ہیں، مسلم ممالک کے پس ماندہ لوگ بھی زمین پر رہنے کے اسی قدر حقدار ہیں۔

کس کو نہیں معلوم کہ ماضیٔ قریب تک جب کہ دنیا کی آبادی فی گھرانہ بارہ تیرہ افراد پر مشتمل ہوا کرتی تھی ، اس وقت کے مقابلے میں دنیا کے وسائل اب حد سے سوا ہوئے ہیں۔ اور انسانوں کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا ہے۔ مزید توجہ طلب بات یہ ہے کہ خالی و بنجر زمین بھی یہاں طول و عرض میں اس قدر بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے کہ موجودہ تعداد جتنے لوگ اس زمین میں ابھی اور بھی سما سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس زمین کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ کوئی آخری لکیر۔ یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے؟، کسی کو بھی نہیں معلوم۔

وہ خدا اگر منصوبہ بندی نہ کررہا ہوتا تو آج یہ زمین مثلاً کیڑوں مکوڑوں ، جھاڑوں جھنکاروں، درختوں پودوں، اور سمندروں اور دریاؤں کے پانیوں سے اس قدر بھر چکی ہوتی کہ ایک انچ قدم رکھنا بھی یہاں محال ہوتا۔ وہ اگر دریاؤں کو مستقل اپنی حدود میں رہنے کا پابند نہ کرتا، اگر وہ صحراوں کی ریتوں کو اپنی حد تک رہنے پر مجبور نہ کرتا، اگر وہ درندوں کو جنگلوں سے باہر آ کر انسانی بستیوں میں نکل نہ آنے کے احکامات صادر نہ کرتا، اگر وہ یہ ساری پابندیاں ان پر از خود عائد نہ کرتا، تو یہاں کا انسان ایک ایک چپے پر خودرو پودوں اور کانٹے دار جھاڑیوں کو اپنے سامنے پاتا، زہریلے ساپ اور بچھوا سے جگہ جگہ ٹکراتے، تیزاب و زہریلی گیسیں اسے کبھی زندہ نہ رہنے دیتیں، اور جگہ جگہ بپھرتے ہوئے دریائی و سمندری پانی اسے اپنی برہمی دکھا دکھا کر بے بس و لاچار کئے رکھتے۔ لیکن کیا دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کچھ کیا ہے؟ نہیں، کیونکہ وہ بہت شفیق اور مہربان ہے۔ وہ بہت زبردست منصوبہ ساز ہے اور رحمت و موٗدت کو اس نے خود پر لازم کرلیا ہے۔ وہ گناہ گار و نیک کار دونوں قسم کے اپنے بندوں کے ساتھ کبھی بے

رحمانہ سلوک نہیں کیا کرتا۔ وہ انسانوں کی مانند بے رحم و سنگ دل نہیں ہے۔ مذکورہ حقائق کا تعلق اگرچہ آبادی منصوبہ بندی کے ساتھ براہ راست نہیں ہے لیکن بتانا یہاں یہ مقصود ہے کہ وہ ایک ایسی قادرِ مطلق ہستی ہے جس کی نگاہ میں دنیا کے مسائل و مصائب اور مثبت و منفی معاملات سب کچھ موجود ہیں۔ اس نے جب یہاں انسانوں کو بسایا ہے تو وہ ان کی فکر بھی رکھتا ہے۔ وہ ان کے لیے وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اور ان کی رہائش کے لیے زمین کو بھی ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں وہ بس اتنے ہی انسانوں کو بھیجتا ہے جتنی اسے یہاں بسانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زائد از ضرورت انسانوں کو وہ خود ہی یہاں نہیں بھیجتا۔ وہ انہیں آسمانوں ہی پر روک لیتا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ روئے زمین کے تمام قابل ترین دماغوں سے بھی وہ زیادہ علیم و خبیر اور منصوبہ بند ہستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ زوجین میں ملاپ کے بعد جنین میں وہ بس ایک ہی بچے کا استقرار کرواتا ہے۔ ملاپ کے باقی تمام تخم صاف ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ مزید ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک قابلِ لحاظ فیصد یہاں ایسے جوڑوں کی بھی ہے جن کے گھروں میں شادی کے بعد عرصہ دراز تک ایک بھی بچہ جنم نہیں لیتا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں جڑواں بچے بھی کبھی کبھی ایک ساتھ جنم لے لیتے ہیں جبکہ شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ماؤں کو وہ ایک ساتھ تین تین اور چار چار بچے بھی عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کے منصوبہ بند ہونے کی کھلی دلیل ہے کہ عام طور پر وہ ”کثرتِ اولاد“ والے اس طرح کے جلوے کی صورتِ حال پیدا نہیں کیا کرتا۔ اگر وہ انسانوں کو اسی طرح تین تین چار چار اکٹھے بھیجنے کی منصوبہ بندی رکھتا، اور ہر ہر بانجھ جوڑے کو ایک دو بچوں سے ضرور ہی نوازتا تو کون ہے جو پھر بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیتا؟ اور کون ہے جو پھر بھی اسے ایسا کرنے سے روک دیتا؟ پھر کیا تب بھی دنیا کی آبادی اسی قدر محدود رہتی؟ اور کیا تب یہ زمین انسانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی محسوس نہیں ہوتی؟

یہ واضح حقیقت کیا ثابت نہیں کرتی کہ زمینی آبادی کی بہترین منصوبہ بندی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں کر رہا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ انسان تو ویسے بھی محدود عقل و صلاحیت کا مالک فرد ہے، اس لیے سو فیصد درست منصوبہ بندی کی توقع اس سے کی ہی نہیں جاسکتی کیونکہ وہ ٹھیک ٹھیک کبھی نہیں بتا سکتا کہ زمین کے اندر کیا کیا وسائل پنہاں ہیں، کس قدر

ہیں ، اور کہاں کہاں ہیں؟۔ اسے تو دس بیس برسوں کے بعد جا کر اچانک خبر ملتی ہے کہ کوئی نیا ذخیرۂ وسائل زیرِ زمین یا سطحِ سمندر پر ابھر آیا ہے جیسا کہ پاکستان میں حال ہی میں تھر کے کوئلے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں ، یا عرب ممالک میں کبھی پیٹرول کے دریا دریافت ہوئے تھے۔

ٹیکنالوجی کا وسیع علم بھی انسانوں کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ ہی نے انڈیلا تھا۔ اور اسی باعث زمین کے وسائلِ خوراک ، پیداوار ، اور سہولیات وغیرہ میں ایک دم کئی گنا اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ انسانوں کو یہ رعایت اللہ تعالیٰ نے اس لیے عطا کی تھی کہ اضافۂ آبادی کے باعث انسان آئندہ کہیں بھوکا نہ رہ جائے ، ننگا نہ رہ جائے ، اور علاج معالجے سے محروم نہ رہ جائے۔

ایک سچی بات یہ بھی ہے کہ آج کے عقل مند انسانوں نے اپنے لیے زندگی کی بجائے موت کو ترجیح دی ہے۔ وہ مہلک بارودی اسلحے ایجاد کرتا ہے ، وہ ایٹم بم سامنے لے کر آتا ہے۔ وہ پست درجے کی نفرتوں کو ابھارتا ہے۔ وہ خونی جنگوں کو طریقِ زندگی قرار دیتا ہے۔ تجربہ گاہوں میں نت نئے مہلک جراثیم کی پرورش کرتا ہے۔ اور بدکاری میں زنا جیسی ہلاکت خیز برائی کو عام کرتا ہے جس کے باعث دردناک اور عجیب وغریب اموات اس کا مقدر بنتی ہیں۔ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ دنیا کے موجودہ وسائل کی تقسیم میں وہ کبھی غیر منصفانہ کردار ادا نہیں کرتا۔ ایک طرف اگر صومالیہ اور دیگر افریقی ممالک میں قحط کے باعث ہزاروں انسان بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو رہے ہوتے ہیں تو دوسری جانب دنیا بھر کے محض دس یا پندرہ افراد کے پاس زمین کے تمام وسائل کا قبضہ موجود ہوتا ہے۔ اکثر ممالک سے خبریں آتی ہیں کہ اپنے ذخیرۂ خوراک کو وہ محض اس وجہ سے برباد کر دیتے ہیں کہ ان کی ضرورتوں سے وہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہی امریکہ جہاں خوشحالی راج کر رہی ہوتی ہے ، وہیں بے شمار امریکی آج بھی ایسے ہیں جو بھوک سے مجبور ہیں اور مکان نہ ہونے کی وجہ سے فٹ پاتھوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ صرف گرمیوں ہی میں نہیں بلکہ سردیوں میں بھی۔!

تیسری دنیا کے جس ملک کی حکومت کا حال بھی دیکھ لیں ، یہی افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے۔ اس کے کرتا دھرتا اربوں روپے کی جائیداد اپنی ذاتی ملکیت میں رکھے ہوئے ہوتے

ہیں جس میں سے وہ ملک کے عوام کو ایک دھیلا بھی عطا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔تو بھلا خوشحالی اور فراخی یہاں کہاں سے راج کرے گی؟ لوگوں کے لیے وسائل آخر کہاں سے پورے ہوں گے؟ کون سا مسلم یا غیر مسلم ملک ایسا ہے جہاں اربوں روپے کی رقم رشوت اور کرپشن کی نذر نہ ہوتی ہو؟، جہاں لامحدود کِک بیکس کا چلن عام نہ ہوتا ہو؟ جہاں درمیانی طبقوں کی بچت پر لاانتہا سود کارپوریٹ ساہوکاروں کی جیب میں نہ جاتا ہو؟ خود مسلم ممالک میں بھی جہاں زکوۃ کا قرآنی حکم لاگو ہوتا ہے (جس کے باعث ان گنت لوگوں کو اپنی غربت سے باہر نکل آنے کا درسامنے کھلا ہوا نظر آتا ہے)، کتنی مسلمان شخصیات ایسی ہیں جو پابندی سے زکواۃ ادا کرتی ہیں یا صدقہ وخیرات کرتی ہیں؟ وسائل کی تقسیم میں انصاف آخر کون برتتا ہے اور کہاں کس ادارے میں برتا جاتا ہے؟

اسی طرح کیا ایک تلخ حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا کے وسائل کا سالانہ پچاس فیصد سے زیادہ حصہ محض جنگوں کی نذر کیا جاتا ہے؟ کیا یہ جنگیں ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ نہیں بن گئی ہیں؟ کیا آج کا انسان بھی اپنے سابقہ جنگلی دور کی طرح محض جنگ وجدل ہی میں زندگی نہیں گزارتا چلا جارہا ہے؟ زمینی دانشوران وحکومتی کار پردازان اس جنگ کے بدلے بڑھتی ہوئی عالمی آبادی کو کیا خوراک، لباس، تعلیم اور علاج وغیرہ کی آسانیاں فراہم نہیں کرسکتے؟ چنانچہ صرف اسی ایک نکتے کی بنیاد پر ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اضافۂ آبادی کا شور مچانا اور مچاتے ہی چلے جانا انتہا درجے کی بے وقوفی بلکہ سفاکی ہے۔خود اپنے حصے کا کام تو ہم کرتے نہیں لیکن الزام اللہ تعالیٰ پر تھوپ دیتے ہیں۔

اس سوال کا جواب خود ہمیں دینا چاہئے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ظلم ہم کر رہے ہیں یا وہ جو اس کائنات کو تخلیق کررہا اور چلا رہا ہے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کرتے کہ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی خوش خبری یہ کائنات دنیا والوں کے سامنے لے کر آرہی ہے؟۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بقول اقبال ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

لاتعداد نئے مواقع اور وسائل ہر عشرے دو عشرے میں دنیا کے سامنے آتے رہتے ہیں۔آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے وسائل میں بھی متناسب اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔بلکہ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ لامحدود زمین اب بھی ایسی پڑی ہوئی ہے جس کا ایک ایکڑ بھی اب تک زیرِ کاشت نہیں لایا گیا ہے۔بے مقصد پڑی ہوئی اس زمین کو کثرتِ آبادی کے غم خوار اگر کاشت کاری کے لیے استعمال کریں تو لاکھوں ٹن اجناس اگلنے کے لیے وہ آج بھی تیار ہے۔اسی طرح نہ جانے کتنے وسائل ٹنوں کے حساب سے زیرِ زمین اب بھی مزید موجود ہیں جن کا دریافت ہونا ابھی باقی ہے۔پس ماندہ ممالک میں تو نااہل حکمرانوں اور ڈاکونما سیاستدانوں نے عرصۂ دراز سے کوئی سرگرمی بھی نہیں دکھائی ہے کیونکہ عوام کو سہولت دیا جانا وہ بالکل پسند نہیں کرتے۔لالچی اور استحصالی کرتا دھرتاؤں کو اپنی دولت و اقتدار کے آگے بھلا کب کچھ سجھائی دیتا ہے؟

چنانچہ دھرتی کے سنوارنے والوں سے زیادہ برباد کردینے والے لوگوں کے منہ سے جب ہم آبادی کی تشویش کے سوالات سنتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ بس ان کے منہ دیکھتے کے دیکھتے ہی چلے جائیں۔یعنی یہ کہ ''وہ کہا کریں اور سنا کرے کوئی!''سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایسی گل افشانیاں یہ لوگ کیسے کرتے پھرتے ہیں؟۔یہ قیمتی خیالات تو ان پر جچتے ہی دکھائی نہیں دیتے۔جی تو پھر بس یہی چاہتا ہے کہ ان کی عقلوں پر مرثیہ پڑھا جاتا رہے۔

سوال یہ ہے کہ آبادی کے بارے میں کیا اسی کو پتہ نہیں ہوگا جس نے لوگوں کو یہ دنیا بنا کر دی ہے؟اور کیا ''وہی نہ جانے گا جس نے اسے تخلیق کیا ہے؟''﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [الملک:۶۷]

یادرکھنے کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا بنانے والی ہستی اللہ تعالیٰ کو انسانوں سے نفرت نہیں بلکہ پیار ہے۔وہ ان سے کراہیت نہیں بلکہ محبت رکھتا ہے۔وہ جب بھی کسی معصوم بچے کو دنیا میں بھیجتا ہے تو اسے اس دنیا کے ذخائر و وسائل کا سب پتہ ہوتا ہے۔نئے بچے کو دنیا میں وہ نفرت سے نہیں بلکہ پیار کے جذبے کے ساتھ روانہ کرتا ہے۔وہ کھیل کو بگاڑتا نہیں،سنوارتا ہے،وہ تباہی و بربادی کو نہیں بلکہ امن و انصاف کو پسند کرتا ہے کیونکہ وہ روئے زمین کے تمام دانشوروں

سے بھی زیادہ بڑا دانشور ہے۔ اور کیونکہ وہ اربوں گنی زیادہ آبادی کی منصوبہ بندی کو بھی ان کے مقابلے میں انتہائی عمدگی کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ اگر آبادی کو بڑھاتا ہے تو وسائل اور علم میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اضافہ کرتا ہے تاکہ یہ دنیا کہیں لنگڑی، لولی اور بانجھ ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی لیے اس کی برپا کردہ منصوبہ بندی پر ہمیں آنکھیں بند کر کے مطمئن رہنا چاہئے، اس شاعر کی مانند جس نے کبھی کہا تھا کہ ؎

تو چرا باشی بہ فکرِ مبتلا
کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

اے بیوقوف فرد، تو بلا وجہ کے اندیشوں اور فکروں میں کیوں مبتلا ہوتا ہے؟ تجھے معلوم نہیں کہ تیرا کام بنانے والا تیرے کاموں کی فکر میں خود ہی مشغول ہے!

دنیا بھر کے معاملات کی معمولی سے معمولی باریکی تک جاننے والی ہستی، آبادی کے بارے میں جب خود ہی بہترین منصوبہ بندی میں مصروف ہو تو پھر جذبات سے کھیلنے والے کوتاہ علم انسانوں کے ملمع فلسفوں کی طرف دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہی کیا ہے؟ فطرت کے کاموں (یعنی اللہ تعالیٰ کے معاملات) سے لڑنے والوں کو پھر نتائج تو بہر حال بھگتنے ہی ہوں گے۔ نہ معلوم اپنے خالقسے لڑنا، جھگڑنا، دخل اندازی کرنا، اور ٹکرانا ہم آخر کب تک پسند کرتے رہیں گے؟

اس موقع پر اگر ہم ایک اہم پاکستانی خاتون، جنگ کی کالم نگار، اور امریکہ میں پاکستان کی سابق سفیر ڈاکٹر ملیحہ لودھی کے خیالات آپ کے سامنے نہ رکھیں تو یہ شاید زیادتی ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ خاتون سیکولر نظریات کی حامل ہیں اور اسلامی تعلیمات کو وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔ تاہم آبادی کے بارے میں اپنی اس تحریر سے وہ حیرت انگیز طور پر ہماری ہم خیال نظر آتی ہیں۔ روزنامہ جنگ کراچی کے شمارے ۱۲۱ کتوبر ۲۰۱۲ میں انہوں نے اپنے کالم کا نام ہی دلچسپ طور پر ''آبادی۔ رحمت یا زحمت؟'' رکھا ہے۔ یہ اس تصور کے بالکل برعکس ہے جس میں بڑھتی ہوئی آبادی کو عالمی طور پر ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ کالم میں باہر سے آنے والی ایک کتاب ''پاپولیشن ڈائینامکس اِن مسلم کنٹریز'' (از ہانس گروتھ اور انفونسو پوزا) کے

مندرجات کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ'اس کتاب میں ان عوامل کا واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے جن کی مدد سے آبادی کے ثمرات سے مستفید ہو جا سکتا ہے'۔ ایک اور پاکستانی ماہر'زیبا سنتھار' کی تحریر کا حوالہ بھی ڈاکٹر ملیحہ لودھی اپنے کالم میں دیتی ہیں جس میں زیبا تحریر کرتی ہیں کہ''اب یہ پاکستان پر منحصر ہے کہ رونما ہونے والی اس تبدیلی سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے یا اس موقع کو ضائع کر دیتا ہے''۔زیبا ستھار مزید تحریر کرتی ہیں کہ'' آبادی سے حاصل ہونیوالے فوائد سے پاکستان کی ترقی کو جلا مل سکتی ہے اور خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جبکہ لڑکھڑاتی ہوئی معیشت کو اس سے واقعتاً فوائد حاصل ہونے کی توقع ہو۔'' زیبا بتاتی ہیں کہ''پاکستان کو اگلے بیس سالوں میں کام کرنے کی عمر کا جمِ غفیر دستیاب ہوگا جبکہ ۲۰۳۰ تک ملک میں کام کرنے والے افراد کی آبادی ۱۶ کروڑ سے بھی تجاوز کر جائے گی''۔(زیبا یہاں سمجھانا چاہ رہی ہیں کہ نوجوان طبقے کی اتنی بڑی قوت پاکستان کی ترقی کے لیے ایک نعمت ثابت ہو سکتی ہے)۔لودھی آگاہ کرتی ہیں کہ زیبا سیتھار آبادیاتی علوم میں مہارت رکھنے والی پاکستان کی صفِ اول کی خاتون ہیں۔

دوسری جانب معروف دانشور نوم چومسکی کہتے ہیں کہ اسی تخفیفِ آبادی کا نتیجہ ہے کہ جرمنی اور جاپان کو اپنی معیشت چلانے کی خاطر بیرونی افراد کی ہمیشہ سخت ضرورت رہتی ہے۔(انٹرویو روزنامہ ایکسپریس ٹرائیبون،کراچی ۱۸ جنوری ۲۰۲۰ء)۔ادھر اردو نیوز جدہ نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۳ ستمبر ۲۰۱۹ء میں آگاہ کیا ہے کہ جرمنی کو ڈھائی لاکھ سالانہ سے زائد تارکین وطن کی ضرور رہتی ہے۔

چنانچہ جدید سیکولر خیالات کی حامل ان دو خواتین کے مندرجہ بالا خوش کن اور حقیقت پر مبنی نظریات کو بھی اب کیا محض فضول اور واہیات کہہ کر مسترد کر دیا جائے گا؟ انسان دانشمند ہو تو بڑھتی ہوئی آبادی اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ہمیں مغرب کی طرف دیکھنا چاہیے جہاں سنگین ترین قلتِ آبادی کے باعث خود ان کی اپنی قوم کے اقلیت میں کھو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔اس بدترین صورتِ حال سے دو چار بھی انہیں انہی حضرات نے کیا ہے جو خود کو آبادی منصوبہ بندی کے ماہر گردانتے ہیں! بندوں کے پیدا کرنے والے کی منصوبہ بندی سے بھی زیادہ بھلا کوئی بہتر منصوبہ بندی کر سکتا ہے؟

کس قیامت کے یہ نامے ادارہ

البرہان کے نام

البرہان کے مضامین پر تبصرے، تنقید، اعتراضات اور ان کے جوابات۔ تجاویز اور مشورے

لیاقت بلوچ (نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان)

ماہنامہ 'البرہان' لاہور کے دسمبر ۲۰۲۲ء کے شمارے میں دورۂ افغانستان کے دوران آپ کے مشاہدات پر مبنی تحریر بعنوان ''سفر افغانستان۔ برائے تعلیمی مقاصد'' پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ ماشاءاللہ! افغانستان کی تازہ ترین معلومات اور امارتِ اسلامی افغانستان کے قیام کے بعد کی صورتِ حال کے حوالے سے نہایت مفید اور معلومات افزاء تحریر ہے۔ ماہنامہ 'البرہان' عرصہ دراز سے جہادِ افغانستان کے دوران سے لے کر اب تک جہاد بالقلم کے میدان پر مورچہ زن ہو کر اپنی ذمہ داریاں کماحقہ ادا کر رہا ہے، جس کے لیے پوری ٹیم مبارکباد اور تحسین کی مستحق ہے۔

مولانا راشد الحق سمیع (مہتمم جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک)

آپ کا سفر نامہ افغانستان ملا۔ ماشاء اللہ بہت مؤثر اور جامع ہے۔ آپ نے بہت خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ میرا بھی ذکر خیر کیا ہے جس کا مَیں مستحق نہ تھا۔ افسوس کہ 'الحق' کل پریس چلا گیا ورنہ ہم اس شمارے میں اسے جگہ دیتے۔ اب ان شاءاللہ اگلے ماہ شائع کریں گے۔

مولانا عبدالقیوم حقانی (مہتمم جامعہ ابوہریرہ، القاسم اکیڈمی و ماہنامہ القاسم، خالق آباد نوشہرہ)

افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے آپ کا مضمون دو دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ آپ کا تجزیہ، جائزہ اور تجاویز نیز طالبان کی کمزوریوں کا ذکر یہ سب حقیقت پر مبنی ہے۔

راجہ احسان عزیز (راولپنڈی)

آپ نے البرہان کے انگریزی سیکشن میں اس دفعہ Iran should support Afghanistan (یعنی ایران کو امارت اسلامی افغانستان کی حمایت کرنی چاہیے) کے نام سے جو مضمون دیا ہے وہ خود البرہان کے ماضی اور حال کی پالیسیوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مَیں حیران ہوں کہ آپ نے یہ مضمون کیسے چھاپ دیا جس میں ایران کی مداحی کی گئی ہے حالانکہ شام اور

یمن میں اس کا جو کردار ہے، سعودی عرب کے خلاف جو کچھ وہ کر رہا ہے اور خود پاکستان اور افغانستان میں اس کا جو منفی کردار رہا ہے، اس کے پیش نظر آپ کو یہ مضمون چھاپنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

حافظ ذیشان حیدر (ایڈووکیٹ، لاہور)

افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے آپ نے اپنے مضمون میں اعداد وشمار دیے ہیں کہ بلوچستان کے دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی شرح تعلیم اس لیے شہری مردوں کی تعلیم کی ایک تہائی ہے کہ لوگ لڑکیوں کی جدید تعلیم کو خلافِ دین سمجھتے ہیں۔ عرض ہے کہ میں کئی دفعہ تبلیغی جماعت میں بلوچستان کے علاقوں میں گیا ہوں اور اپنے تجربات کی روشنی میں برملا کہہ سکتا ہوں کہ بلوچستان میں خواتین میں شرح خواندگی کم ہونے کی وجہ قطعاً دین داری نہیں ہے۔

[**البرہان:** حافظ صاحب! دین ناپنے کا صرف یہی معیار نہیں ہے کہ کتنے لوگ مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں یا تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلتے ہیں۔ پردے کی پابندی اور غیرت کا تصور بھی اسلامی اصول واقدار کی وجہ سے ہی ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کا حصہ بن چکا ہے]۔

ڈاکٹر محمد غیاث (شعبہ علوم اسلامیہ، رفاہ یونیورسٹی اسلام آباد)

'افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ' والے مضمون میں آپ نے طالبان کی اس رائے کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے مؤقف پر دوسروں کے تبصرے کو بیرونی مداخلت سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں دوسروں کی مداخلت کی ممانعت تب ٹھیک ہوگی جب دین صرف ان کا مقامی مسئلہ ہوتا۔ دینِ اسلام آفاقی ہے۔ ان کے طرز عمل سے جو نقصان دین کا ہوتا ہے وہ صرف ان کا نہیں بلکہ پوری امت کا نقصان ہے لہٰذا ان کی یہ بات شرعی لحاظ سے بھی غلط ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ابوالوفاء محمود (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

آپ نے نیا سال منانے والوں اور اس کی مبارکباد دینے والوں کے بارے میں جو لکھا ہے کہ یہ تو مسیحیوں اور یہودیوں کا سالِ نو ہے، تو میرے خیال میں یہ محتاجِ نظر ثانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! سال شمسی ہو یا قمری ہو، دونوں اللہ کی تخلیق ہیں دونوں حسابِ ربی کے پابند ہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں شمسی سال رائج ہے۔ میری ناقص رائے میں دونوں میں مبارکباد پیش کرنا معیوب نہیں۔ مبارک باد دراصل خیر وبرکت کی دعا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۷۶)

the neo-colonial capitalist government from an Islamic revolutionary perspective.

In the present circumstances it is particularly important that our representatives in parliament continuously and consistently present a case for immediately instituting a planned default, a halt to all borrowings from multilateral, bilateral and commercial market sources and the rejection of a new IMF "stabilization" program. We must endeavor to show that such a move undermines genuine stabilization of the macro economy and that the stabilization that the IMF seeks to impose on Pakistan is a stabilization of the graveyard.

بقیہ: البرہان کے نام

[**البرہان:** بجا فرمایا! شمس وقمر دونوں اللہ کی تخلیق ہیں لیکن اس پر بھی غور فرمائیے کہ حضرت عمرؓ نے نیا کیلنڈر کیوں جاری کیا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشبہ بالکفار کی مذمت کیوں کی؟ بہت سی احادیث "خالفوا المشرکین والیھود" سے کیوں شروع ہوتی ہیں؟ دراصل شریعت مسلمانوں کی الگ شناخت (Identity) چاہتی ہے تاکہ وہ بحیثیت مسلمان دوسروں سے متمیز رہیں۔ ان کی اپنی الگ پہچان ہو۔ بھارت میں ہندوؤں کا اپنا کیلنڈر ہے، ایرانیوں کا اپنا ہے، اسرائیل کا اپنا ہے تو کیلنڈر ہر قوم کی پہچان ہوتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو اپنا کیلنڈر ہی استعمال کرنا چاہیے۔ اور آپ جیسے فاضل دین دار احباب کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہمارے معاشرے میں مغرب میں مروج کیلنڈر کیوں مستعمل ہے اور مسلمانوں میں مروج ہجری کیلنڈر کیوں استعمال نہیں ہوتا؟ اگر اس کی وجہ مغرب کی دو سو سالہ غلامی ہے تو کیا ہمیں اس غلامی کے اثرات سے چمٹے رہنا چاہیے یا اس سے جان چھڑانی چاہیے۔]

exchange and import licensing. All foreign exchange inflows and outflows will be channeled through the government.

4. We will immediately nationalize banks (including Islamic banks) and financial institutions, abolish the money and capital markets and gradually substitute for the Pakistani rupee a new currency called the Islamic Dinar. The issuance and distribution of the Islamic Dinar will be linked not to foreign exchange reserves but to national physical production requirements and demand. We will institute currency and credit planning.

5. Our main concern will be the enhancement of factor productivity. We will promote investment in the capital goods industries (defense production, ITC, heavy machinery, electrical, steel). These industries will be nationalized.

6. We will abolish the zameendari system and confiscate all harbi lands without compensation and distribute them among the harees and mazaras. We will institute usher on agricultural capital and production.

7. We will promote self-employment and integrate the formal and informal sector of the economy. Economic policy will be domestic demand – and not export driven and will seek to promote import substitution especially in the food, pharmaceutical, capital equipment, ITC and service sectors. We will ban the export of professional capital (doctors, engineers, management professionals, ITC workers from the country).

This is something of a wish list as the possibility of an Islamic revolutionary regime coming into power in 2023 are nil. Nevertheless it is important that Islamic party representatives (30 to 35 such can be elected provided there is electoral unity among the main Islamic parties in 2023) adopt a revolutionary stance in the national assembly and from the opposition benches criticize the macroeconomic strategy of

2. We do not anticipate any serious impact on the economy of default. Receipt of foreign capital markets and multinational sources will be suspended but since these inflows are used mainly for debt servicing their termination will have no serious effects on the overall investment level. Foreign portfolio investment has been negative or negligible for several years and net FDI flow has been a trivial component of gross capital formation. We do not expect a termination of direct investment under the CPEC program. No country which has suspended debt payments in the past – Argentina, Sri Lanka, Lebanon and Ecuador etc. – has suffered an exclusion from export markets or been subjected to sanctions. We do not expect any negative impacts on our exports due to debt default. It is also unlikely that sanctions will be imposed consequent to default. Sanctions are usually imposed for political – not for economic – reasons. Pakistani debt is a miniscule proportion of global debt outstanding and its' payment of its suspension will have no visible impact on global finances. Sanctions may be imposed to punish Pakistan for installing an Islamic regime but sanctions will have no serious impact on our economy. Sanctions were imposed in 1998-99 in response to our nuclear explosion and all international capital inflows were suspended but the economy grew by 5 percent that year. CPI inflation was about 3 percent and gross domestic capital formation was positive.

3. An Islamic revolutionary government will severe all links with global capital markets since global financial transactions are all riba and gharar based. It will institute a managed fixed exchange rate regime. We will not contract any foreign loans (in the form of bonds, sukuk or commercial or multinational source borrowings). We will impose strict capital controls on both current and financial accounts of the balance of payments and institute a system of foreign

Debt rescheduling has always meant an increase in the debt payment obligations of the client countries. This has been the experience of Mexico, Argentina, Greece, Egypt, Tunisia, the Soviet Union and all other countries that have negotiated debt rescheduling agreements with imperialist governments and markets.

Current estimates show that if the China debt to Pakistan is rescheduled for a 10 year period, debt payment obligation to that country will go up by at least 36 percent (without any further net addition to existing debt).

Capitalist neocolonial regimes whether of the PPP, PML or PTI will not only seek debt rescheduling, they will continue to borrow from commercial banks and bond and Sukuk markets. The funds so obtained will be absorbed primarily in debt servicing and in enhanced corruption. They will not be used for promoting factor productivity growth since neocolonial government in Pakistan will remain committed to maintaining the institutional and sector stasis that has existed in the country during the colonial and neocolonial era (roughly 1799 to date).

The Islamic Alternative

I now take up the hypothetical question of what an Islamic revolutionary government may do in the unlikely event that it comes to power in 2023.

1. Immediately default on all official and commercial debt payments will be suspended and negotiations with all creditors for debt reduction and cancellation will be instituted. We would immediately and irrevocably cancel all interest payment obligations (as they are considered *haram* by both Islam and Christianity). Payment of principal amount due will be related to export and remittance receipts (say 10 percent of export and receipts which each year will be allocated to payment of principal debt outstanding).

subservience to imperialism means that both PDM and the PTI remain committed to maintaining Pakistan's existing subservience to global capitalism. This commitment to imperialism is shared by the establishment – since the military remains heavily dependent on foreign arms procurement and logistic support.

The Pakistani state is a postcolonial state with the dominant elite entrenched in the institutional loci of power erected by the British Empire. The state institution – the bureaucracy, the judiciary, the corporate sector, finance, the media, the legislature – remain moulded along colonial lines and all the obstacles to national capitalist development created by imperialism remain in place.

Hence the alienation – and inefficient integration – of the semi-capitalist economy with the formal sector and the restraint on factor productivity growth. Total factor productivity has stagnated since the late 1980s and stabilization of the economy in present circumstances can only take place at a low (near zero per capita) growth level.

Given the institutional stasis no capitalist regime – PPP, PML or PTI – can afford to craft a national self-reliant, high growth strategy. All capitalist regimes – PPP, PML, PTI – must go begging bowl in hand to imperialist governments and markets. Hence the IMF insists on low growth "stabilization" – the stabilization of the graveyard. Hence Hafiz Shaikh, Shaukat Tareen, Miftah Ismail, Ishaq Dar – see salvation solely in obtaining imperialist financial and political support.

Currently Mr. Dar is seeking rescheduling – as Musharraf did in 2002 following his betrayal of the Afghan Jihad – from China, Saudi Arabia, UAE, the IMF and other imperialist agencies. He regards debt default to be an unmitigated catastrophe. He does not even seek a "haircut" – i.e. a reduction in the total debt payment obligation.

currently trading at less than one third of face value with an average coupon rate of about 17 percent – and still very low demand. Both Moody's and Fitch have downgraded Pakistan's rating and foreign portfolio investment is negative. In fiscal year 2023 Pakistan needs about $12 billion to meet debt servicing charges and other foreign obligations.

Mr. Dar is seeking a costly rescheduling of non-Paris Club debt ($27 billion) and has repeatedly ruled out the possibility of default or of seeking reduction to the debt outstanding (hair cutting).

Pakistan's external debt is about $133 billion about 76% of current GDP. The Rupee has suffered accelerated depreciation since 2019 when the ongoing IMF-ESAF program came into effect and the Rupee was subjugated to global money markets pressure. Imran Khan's government de-nationalized the SBP in 2018 and handed over its control to global money markets and the IMF.

The first macroeconomic agreement was signed with the IMF by Ayub Khan's government in 1958. From the period 1958 to 2023 there have been 22 such agreements. The IMF agreements have depressed growth, stifled investment, fueled structural economic deformities and catastrophically increased both domestic and foreign indebtedness of the government (and of the private capitalist sector).

The Capitalist Response

All governments since independence have been capitalist governments. All governments have been imperialist camp followers. Over time the dependence of the domestic capitalist sector (government, financial institutions, large scale manufacturing) has increased. That is why there is a continuity in the economic perspective of the incumbent regime (Imran Khan's government (and the People's Party and Muslim League regimes of 2008-2018). This

Dr. Javaid Akbar Ansari

Stabilizing the Economy
An Islamic Revolutionary Approach

Objectives

This essay seeks to:

1. Analyze Pakistan's current macro-economic situation
2. Asses the proposed "reform" plan of capitalist neocolonial government.
3. Present an outline of an Islamic revolutionary alternative to capitalist macro-management strategies.

The Macro-Economic Situation

Pakistan's macroeconomic structure is dualistic. There is a large self-sustaining domestic sector with weak links to global capitalism ineffectively subordinated to the national capitalist state. It amounts to between 40 to 50 percent of gross national value (estimates vary) on an annual basis. A large proportion of this semi-integrated sector is undocumented/informal but it also contains all those businesses and economic activities which are focused on servicing domestic demand. This sector is relatively insulated from the deepening global capitalist recession.

The formal economy (consisting of government, defense, the financial network and large scale manufacturing) is intensely subordinated to global capitalist states and markets. It is this formal sector (and not the semi-capitalist sector) which is engulfed in crisis.

The crisis of the capitalist sector is a crisis of indebtedness – especially foreign indebtedness. The official (SBP) reserves have effectively fallen to zero as they consist entirely of loans from China and the remainder from global multinational and private banks. Pakistan's Euro bonds are

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبرشمار	کتاب	صفحات	نمبرشمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)		۲۱	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰	۲۲	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰	۲۳	اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)	
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷		**اسلام اور مغربی فکر و تہذیب**	
۴	یکساں قومی نصاب-خدشات ومضمرات	۲۰۸	۲۴	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰	۲۵	اسلام اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸	۲۶	اسلام اور ردِّ مغرب	۲۱۶
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶		**تفہیم دین**	
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰	۲۷	مسلم نشاۃ ثانیہ-اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
	طلبہ کی اسلامی تربیت		۲۸	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۹	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲	۲۹	رزم حق و باطل	۸۰
۱۰	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت-ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰	۳۰	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
	اصلاحِ دینی مدارس		۳۱	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۱۱	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰	۳۲	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۱۲	نصابِ مدنیؒ	۴۰	۳۳	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
۱۳	مدرسہ ڈسکورسز-مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶		**باللغة العربية**	
۱۴	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲	۳۴	السلطة التشريعية_ دراسة مقارنة	۱۵۰
	اسلامی تحریکیں			**English Books**	
۱۵	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰	۳۵	Islamization of Laws in Pakistan	250
۱۶	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸	۳۶	Riyaz us Saliheen I & II	950
۱۷	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴	۳۷	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500
۱۸	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲			
	تزکیۂ نفس				
۱۹	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳			
۲۰	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲			

مکتبہ البرہان

۹۱۔ بابر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

ای میل ermpak@hotmail.com

CPL No. 296 Monthly Al Burhan February 2023

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی نئی تصنیف

اسلام اور تعمیرِ سیرت
عصرِ حاضر میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

’اسلام اور تزکیۂ نفس‘ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی ضخیم علمی کتاب (۹۲۸ صفحات) اور دو مختصر کتابچوں کے باوجود ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس میں اس موضوع کا احاطہ بھی کیا گیا ہو اور وہ متوسط حجم کی بھی ہو۔ بہت سے اضافی مباحث کے ساتھ۔ ۴۰۰ صفحات

مکتبہ البرہان لاہور